حدیث وسنت کے بارے میں غامدی صاحب
کے غلط نظریات کا علمی و تحقیقی جائزہ

جاوید غامدی
اور
انکارِ حدیث

پروفیسر مولانا محمد رفیق مدظلہ العالی

﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾

[الحشر :7]

"اور جو کچھ رسول ﷺ تمہیں دیں، لے لو اور جس چیز سے روکیں اُس سے رُک جاؤ۔"

جاوید غامدی اور انکارِ حدیث

حدیث وسنت کے بارے میں غامدی صاحب کی غلط
اور گمراہ کن تعبیر کا علمی و تحقیقی جائزہ

پروفیسر مولانا محمد رفیق

مکتبہ قرآنیات، لاہور



نام کتاب : جاوید غامدی اور انکارِ حدیث

مؤلف : پروفیسر مولانا محمد رفیق

ناشر : مکتبہ قرآنیات، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ،
اُردو بازار لاہور۔ پاکستان
فون: 5811297، موبائل: 0321-7724032
0333-4399812

اہتمام : حافظ تقی الدین

سن اشاعت : جون 2008ء

قیمت : -/140 روپے

ملنے کے پتے

مکتبہ قرآنیات ، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

1۔ کتاب سرائے ، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار لاہور

2۔ کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار، راولپنڈی

فرمانِ باری تعالیٰ

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾

[النساء: 115]

''جو شخص رسول ﷺ کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے پر چلے گا حالاں کہ اُس پر صحیح راستہ واضح ہو چکا ہو تو اُسے ہم اُسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور پھر اسے جہنم میں داخل کریں گے جو بہت برا ٹھکانا ہے۔''

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی ست
(اقبالؒ)

(دین یہ ہے کہ اپنا تعلق سیّدنا مصطفیٰ ﷺ سے جوڑو۔ ورنہ ابولہب کی طرح گمراہ ہو جاؤ گے۔)

فہرست مضامین

باب نمبر 5:

باب نمبر 6:

باب نمبر 7:

باب نمبر 8:

باب نمبر 9:

باب نمبر 10:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

بیاں میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے!

مغرب سے مرعوبیت کے زیر اثر ہمارے ہاں تجدد پسندی (Modernism) اور انکارِ حدیث کا فتنہ پچھلے ڈیڑھ سو برس سے پھیلایا جا رہا ہے۔ اس کا آغاز تو سر سیّد احمد خان سے ہوا تھا۔ پھر چند اور حضرات اسے لے کر آگے بڑھے۔ پھر غلام احمد پرویز صاحب نے اسے خوب پروان چڑھایا اور اب جاوید احمد غامدی صاحب نے اسے ضلالت اور گمراہی کی آخری انتہا تک پہنچا دیا ہے۔

جدیدیت (Modernity) کے نئے نام سے پھیلایا جانے والا یہ فتنہ فتنۂ ہزار رنگ ہے جو قادیانیت، پرویزیت، مغربیت (Westernisation)، تجدد، اور اعتدال پسند روشن خیالی (Enlightened Moderation) جیسے عناصر کا مرکب ہے۔ اس میں مسلّمہ دینی امور کے بارے میں شکوک و شبہات اور غلط تاویلات ہیں۔ قرآن مجید کی معنوی تحریف ہے۔ اس کی ایک کے سوا باقی تمام قراءتوں کا انکار ہے۔ حدیث و سنت کا استخفاف اور انکار ہے۔ دینی اصطلاحات کے مفاہیم بدلنے کی سازش ہے۔ مسلّماتِ دین اور اجماعِ امت کا انکار ہے۔ کبرِ نفس اور غرورِ علمی کے باوجود حکومت وقت کی کاسہ لیسی ہے۔ علمائے دین کی تحقیر ہے۔ مغربی تہذیب کو اسلام کے لبادے میں پیش کرنے کی ناپاک جسارت ہے۔ مسلمان عورت کے لیے پردے کے شرعی حکم کا اور شراب نوشی پر شرعی سزا کا انکار ہے۔ مجسمہ سازی (Sculptures) موسیقی اور گانے بجانے کا جواز ہے۔

پھر چونکہ اب اس فتنے کو سرکار دربار، مغربی ایجنسیوں این جی اوز اور میڈیا کی پشت پناہی حاصل ہے، اس لیے علمائے دین کا فریضہ ہے کہ وہ اسے معمولی سمجھ کر ہرگز نظر انداز نہ

کریں اور مولانا محترم زاہد الراشدی صاحب (گوجرانوالہ) کی طرح مصلحت اندیشی اور لیپاپوتی سے کام نہ لیں بلکہ محترم ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب (لاہور) کی طرح کھل کر اس گمراہی کا تعاقب کریں۔ ہماری رائے میں جاوید غامدی صاحب متجدد بھی ہیں اور منکر حدیث بھی کیونکہ تجدد اور انکارِ حدیث دونوں لازم وملزوم چیزیں ہیں۔ موصوف کی حماقت، ضلالت اور شقاوت کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنے فہم قرآن کو نبی کریم ﷺ کے فہم قرآن پر اور اپنے فہم حدیث وسنت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تمام محدثین اور فقہائے اسلام کے فہم حدیث و سنت پر ترجیح دیتے ہیں ؏

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

درج ذیل وجوہات کی بنا پر ہمارے نزدیک غامدی صاحب منکر حدیث قرار پاتے ہیں کیونکہ:

1: انہوں نے سنت کا اصطلاحی مفہوم بدل ڈالا ہے۔ وہ نبی کریم ﷺ کے قول وفعل اور تقریر وتصویب کو سنت نہیں مانتے۔ اُن کے ہاں سنت کا مفہوم یہ ہے کہ:

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔"

(میزان ص 14، طبع سوم، مئی 2008، لاہور)

2: وہ سنت کو قرآن سے مقدم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے۔"

(اصول ومبادی، ص 51، طبع دوم، فروری 2005ء، لاہور)

3: وہ سنت کا تعلق صرف اعمال سے جوڑتے ہیں اور قولی سنتوں کا انکار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے، یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں......

علمی نوعیت کی کوئی چیز بھی سنت نہیں ہے اس کا دائرہ کرنے کے کام ہیں۔"

(میزان ص 58، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی ص 65، طبع دوم، فروری 2005ء، لاہور)

4: وہ سنت کے ثبوت کے لیے اجماع اور تواتر کی شرط لگاتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

"قرآن ہی کی طرح سنت کا ماخذ بھی امت کا اجماع ہے اور جس طرح وہ صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے امت کو ملا ہے، اسی طرح یہ ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے۔"

(اصول ومبادی، ص 67، 11، 70، طبع دوم، فروری 2005ء، لاہور)

(میزان ص 60، 14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

5: وہ سنت کو درج ذیل صرف 27 اعمال میں محدود و محصور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

"(1) نماز (2) زکوٰۃ اور صدقہ فطر (3) روزہ و اعتکاف (4) حج و عمرہ (5) قربانی اور ایام تشریق کی تکبیریں (6) نکاح وطلاق اور اُن کے متعلقات (7) حیض ونفاس میں زن وشو کے تعلق سے اجتناب (8) سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت (9) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ (10) اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا (11) ملاقات کے موقع پر 'السلام علیکم' اور اُس کا جواب (12) چھینک آنے پر 'الحمد للہ' اور اُس کے جواب میں 'یرحمک اللہ' (13) نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت (14) مونچھیں پست رکھنا (15) زیر ناف کے بال کاٹنا (16) بغل کے بال صاف کرنا (17) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا (18) لڑکوں کا ختنہ کرنا (19) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی (20) استنجا (21) حیض ونفاس کے بعد غسل (21) غسل جنابت (23) میت کا غسل (24) تجہیز وتکفین

(25) تدفین (26) عید الفطر (27) عید الاضحیٰ۔
سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں۔"

(میزان، ص10، طبع دوم اپریل 2002ء، لاہور)

(اصول و مبادی، ص10، طبع دوم، فروری 2005ء لاہور)

(میزان، ص14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

6: وہ تمام احادیث نبویہ کو 'اخبار آحاد' (خبر واحد) قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:
"رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار آحاد جنہیں بالعموم 'حدیث' کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا، اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔"

(میزان، ص15، 61، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

(اصول و مبادی ص11، 68، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

7: وہ حدیث کو دین کا حصہ نہیں سمجھتے۔ چنانچہ انہوں نے لکھا ہے کہ:
"اس (حدیث) سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔"

(میزان ص15، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول و مبادی ص11، طبع دوم فروری 2005ء لاہور)

8: وہ حدیث کو دین کا ماخذ تسلیم نہیں کرتے اور اس سے ثابت شدہ کسی عقیدے عمل یا حکم کو نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:
"نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں 'حدیث' کہا جاتا ہے اُن کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اُن سے دین میں کسی عقیدہ و

عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔"

(اصول و مبادی، ص 68، طبع دوم فروری 2005ء لاہور)

(میزان ص 61، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

9: وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں کیا تھا۔ اس بارے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ:

"نبی کریم ﷺ نے ان (احادیث) کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔" (میزان، ص 68، طبع دوم اپریل 2002ء، لاہور)

10: وہ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی عام حکم میں تخصیص یا تحدید کے قائل نہیں۔ چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

"حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوءِ فہم اور قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے۔"

(میزان ص 35، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول و مبادی، ص 36، طبع فروری 2005ء لاہور)

11: وہ مرتد کے لیے سزائے قتل کو نہیں مانتے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

"ہمارے فقہاء کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے قرآن و سنت کے باہمی ربط سے اس حدیث "مَنْ بَدَّلَ دِينَهُ فَاقْتُلُوهُ" کا مدعا سمجھنے کے بجائے اسے عام حکم ٹھہرا کر ہر مرتد کی سزا موت قرار دی اور اس طرح اسلام کے حدود و تعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کر دیا، جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں ہے۔" (برہان، صفحہ 143، طبع چہارم، جون 2006ء)

12: وہ شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد (سزا) تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ

لکھتے ہیں کہ:

''زانی مرد ہو یا عورت، اُس کا جرم اگر ثابت ہو جائے تو اس کی پاداش میں اُسے سو کوڑے مارے جائیں گے۔'' (میزان، ص 624، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

13: وہ مسلمان کو کافر کا اور کافر کو مسلمان کا وارث سمجھتے ہیں اور ان کے درمیان وراثت کی ممانعت کو قدیم عرب مشرکین اور یہود و نصاریٰ تک محدود مانتے ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''نبی کریم ﷺ نے اسی (قرابت نافعہ) کے پیش نظر جزیرہ نمائے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے بارے میں فرمایا: ''لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم'' (بخاری / 6764) یعنی اتمامِ حجت کے بعد جب یہ منکرین حق خدا اور مسلمانوں کے کھلے دشمن بن کر سامنے آ گئے ہیں تو اس کے لازمی نتیجے کے طور پر قرابت کی منفعت بھی اِن کے اور مسلمانوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ چنانچہ یہ اب آپس میں ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔'' (میزان ص 525، 526، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

14: وہ قتل خطا میں دیت کے مستقل شرعی حکم کو عارضی اور وقتی مانتے ہیں۔ اس کی مقررہ مقدار کو منصوص نہیں مانتے بلکہ اس میں ہر دور میں تبدیلی کے قائل ہیں اور یہ کہ مرد اور عورت کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چنانچہ وہ بیان کرتے ہیں کہ:

''اسلام (قرآن) نے دیت کی کسی خاص مقدار کا ہمیشہ کے لیے تعین کیا ہے، نہ عورت اور مرد، غلام اور آزاد اور کافر اور مومن کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھیرائی ہے۔''

(برہان، ص 18، طبع چہارم، جون 2006ء لاہور)

(میزان، ص 623، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

15: وہ قمری مہینے کے آغاز کی تعیین کے لیے رویت ہلال (چاند دیکھنے) کے شرعی حکم کو نہیں

مانتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''مہینے کی تعیین کے لیے چاند دیکھنے کو لازم نہیں کیا گیا...... گھڑی ایجاد ہو جانے کے بعد ہم اپنی نمازوں کے لیے جس طرح سورج کا طلوع وغروب دیکھنے کے پابند نہیں رہے، اسی طرح قمری مہینوں کی تعیین کے لیے رویت ہلال کے پابند بھی نہیں رہے۔'' (ماہنامہ اشراق، جنوری 2009، شذرات، ص 3، لاہور)

16: وہ شریعت میں صرف دو جرائم پر قتل کی سزا کے قائل ہیں، ایک قتل نفس اور دوسرا فساد فی الارض۔ اس کے سوا وہ کسی اور جرم پر قتل کی شرعی سزا کو نہیں مانتے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''موت کی سزا قرآن کی رُو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں بھی نہیں دی جاسکتی۔''

(میزان ص 283، طبع دوم، اپریل 2002ء، لاہور)

(میزان ص 611، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

17: وہ زکوٰۃ کے نصاب کو منصوص اور مقرر نہیں مانتے بلکہ ریاست کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ جب چاہے زکوٰۃ کی مقداروں میں کمی بیشی کر دے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ریاست اگر چاہے تو حالات کی رعایت سے کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے سکتی اور جن چیزوں سے زکوٰۃ وصول کرے، اُن کے لیے عام دستور کے مطابق کوئی نصاب بھی مقرر کر سکتی ہے۔''

(میزان، ص 353، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(قانون عبادات ص 119، طبع دوم، اپریل 2005ء)

18: وہ صرف چار چیزوں کو شرعی طور پر حرام سمجھتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کے ذریعے اُسے (انسان کو) بتایا کہ سؤر، خون، مردار اور اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور بھی کھانے کے لیے پاک نہیں ہیں اور انسان کو اُن سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں شریعت کا

موضوع اصلاً یہ چار چیزیں ہی ہیں قرآن نے اسی بنا پر بعض جگہ قُلْ لَّآ اَجِدُ فِیْ مَآ اُوْحِیَ اِلَیَّ اور بعض جگہ 'اِنَّمَا' کے الفاظ میں پورے حصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی چار چیزیں حرام قرار دی ہیں۔''

(میزان ص 633،632، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

19: اُن کا دعویٰ ہے کہ دجال کسی شخصیت کا نام نہیں ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قیامت کے قریب یاجوج ماجوج ہی کے خروج کو دجال سے تعبیر کیا ہے۔'' (ماہنامہ اشراق، شمارہ جنوری 1996ء، ص 61)

20: وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ سیّدنا عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں اور قیامت کے قریب دنیا میں دوبارہ تشریف نہیں لائیں گے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''حضرت مسیح علیہ السلام کو یہود نے صلیب پر چڑھانے کا فیصلہ کرلیا تو فرشتوں نے ان کی روح ہی قبض نہیں کی، اُن کا جسم بھی اٹھالے گئے کہ مبادا یہ سرپھری قوم اس کی توہین کرے۔'' (میزان حصہ اوّل، ص 22، طبع 1985ء، لاہور)

''نزولِ مسیح کی روایتوں کو اگرچہ محدثین نے بالعموم قبول کیا ہے، لیکن قرآن مجید کی روشنی میں دیکھیے تو وہ بھی محلِ نظر ہیں۔''

(میزان، ص 178، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

یہ ہیں غامدی صاحب کے عقائد و نظریات اور ہمارے نزدیک وہ اپنے انہی عقائد و نظریات کے سبب سے منکرین حدیث میں شمار ہوتے ہیں۔

وہ آئے دن زبانی اور تحریری طور پر اپنے نظریات و عقائد اور آراء تبدیل کر لیتے ہیں اور اس حرکت کو فکری ارتقاء کا نام دے کر لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ سنن کی تعداد میں انہوں نے یہی حربہ استعمال کیا ہے۔ حالاں کہ دین میں کوئی نئی رائے اختیار کرتے وقت اپنی پہلی رائے سے رجوع کا ذکر ضروری ہے۔ لیکن ان کی کتب کے نئے ایڈیشنوں میں ان کی نئی آراء شامل ہوتی ہیں۔ جبکہ وہ اپنی پہلی آراء سے رجوع کا ذکر نہیں کرتے۔

اسی طرح کبھی وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے اور علمائے اسلام بالخصوص اہل سنت سے کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے محض 'تعبیر' کا اختلاف ہے ورنہ وہ خود بھی اہل سنت بلکہ احناف ہی میں سے ہیں۔ لیکن دراصل 'تعبیر' کے لفظ کے ذریعے وہ دوسروں کو مغالطہ اور فریب دینے کی کوشش کرتے ہیں ظاہر ہے اگر معاملہ اجتہادی اختلافات کا ہو تو اس میں تعبیر کے فرق و اختلاف کا جواز ہے لیکن اگر بات دین کے نصوص اور مسلمات کی ہو تو یہی الگ تعبیر ضلالت بلکہ کفر تک منتج ہو سکتی ہے۔

مثال کے طور پر قادیانی حضرات بھی قرآن کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر انہوں نے قرآنی الفاظ 'خاتم النّبیین' کی غلط تعبیر کر کے نہ صرف اپنے لیے جھوٹی نبوت کا دروازہ کھولا ہے بلکہ وہ اپنی اس حرکت سے غیر مسلم قرار پاتے ہیں۔ یہ بھی محض تعبیر ہی کا فرق ہے جو آگے چل کر کفر و اسلام کا فرق بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے تصورِ حدیث و سنت نے ان کو انکارِ حدیث و سنت تک پہنچا دیا ہے۔

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی محلِ نظر ہے کہ وہ اصولِ دین میں علمائے اہل سنت ہی کے پیرو ہیں۔ سوال یہ ہے اگر وہ علمائے اہل سنت ہی کے اصولوں کو مانتے ہیں تو ان کے ہاں ان اصولوں کے نتائج اُن سے مختلف کیوں نکلتے ہیں؟ جن اصولِ دین کی پیروی سے اہل سنت ہدایت کی راہ پاتے ہیں انہی اصولِ دین کو اپنا کر غامدی صاحب ضلالت کی اندھیری راہوں میں کیوں جا بھٹکتے ہیں؟ مثال کے طور پر علمائے اہل سنت جب قرآن و حدیث کے فہم کے لیے اپنے اصولِ دین کو کام میں لاتے ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ سنت کی رو سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے مگر جب انہی اصولوں کے ذریعے غامدی صاحب قرآن و حدیث کا مطالعہ فرماتے ہیں تو ان کو مرتد کے لیے سزائے قتل نظر نہیں آتی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ درخت تو اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے نہ کہ جڑ سے! لہٰذا اہل سنت سے نصوص اور مسلمات میں اختلاف کرنے کے بعد غامدی صاحب اہل سنت کے دائرے سے باہر نکل جاتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں غامدی صاحب کے تصورِ حدیث و سنت کا بھرپور علمی جائزہ اُن کی تحریروں کے حوالے سے لیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک سوالنامہ بھی درج کیا گیا ہے جس

سے غامدی صاحب کی اصل شخصیت کو سمجھنے اور اُن کے عقائد ونظریات جاننے میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس کاوش کا مقصد صرف احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہے۔ اس سے قبل ہم نے اپنی کتاب ''غامدی مذہب کیا ہے'' میں بھی غامدی صاحب کے غلط اور گمراہ کن عقائد ونظریات پر نقد کیا ہے۔ ان کے بارے میں ایک اور جامع کتاب بھی زیرِ ترتیب ہے۔ یہ سارا کام میرا فرض بھی ہے اور یہ مجھ پر قرض بھی۔ میں موصوف کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ ابھی سترہ برس کے بے ریش لڑکے تھے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان کی کئی سالہ رکنیت ختم کر کے اُن کو جماعت اسلامی (لاہور) سے کیوں نکالا گیا تھا۔ ہم ان کو ماہنامہ 'محدث' کی گزشتہ دو اشاعتوں کے ذریعے مناظرے کا چیلنج بھی دے چکے ہیں جس کے لیے وہ تا حال دانستہ طور پر تیار نہیں ہوئے۔ البتہ انہوں نے اپنے بھانجے سمیت دو افراد کو ایڈیٹر 'محدث' کے ہاں بھیجا تا کہ ان کے خلاف ہمارے سلسلۂ مضامین کو رُکوایا جاسکے ویسے وہ کبرِ نفس کے سبب اپنے اوپر تنقید کا جواب خود اپنے نام کے ساتھ دینا پسند نہیں کرتے بلکہ اپنے شاگردوں کے نام سے جواب عنایت فرماتے اور اپنی بعض تحریریں اپنے احباب کے نام سے شائع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حق بات سننے، سمجھنے اور اس کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿فَبَشِّرْ عِبَادِO الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ﴾

(الزمر: 18)

''پس میرے اُن بندوں کو خوشخبری دے دیجیے جو کلام کو غور سے سنتے اور اس کے بہتر پہلو کو اختیار کرتے ہیں۔''

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ...... وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ ۭ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ.

والسلام

محمد رفیق چودھری

لاہور

12/فروری 2009ء

بمطابق 16 صفر المظفر 1430ھ

باب نمبر 1:

سنت کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟

جس طرح منکرین حدیث معروف دینی اصطلاحات کا مفہوم بدلنے کی جسارت کرتے ہیں اسی طرح غامدی صاحب بھی یہی حربہ استعمال کر کے انکارِ حدیث کی راہ کھولتے ہیں۔ چنانچہ وہ سنت کی اصطلاح کا مفہوم بدلتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن میں اس کا حکم آپ کے لیے اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ○﴾ (النحل: 123)

"پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہیں تھا۔"

(میزان: ص 14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی: ص 10، فروری 2005ء، لاہور)

اسلامی شریعت میں 'سنت' کی اصطلاح کا کیا مفہوم ہے؟ یہ اصطلاح چودہ صدیوں سے امت مسلمہ کے ہاں کن معنوں میں مستعمل ہے؟ اور غامدی صاحب اس اصطلاح سے اپنا کیا مفہوم نکال رہے ہیں اور اس بارے میں قرآنِ مجید کی جس آیت سے وہ دلیل پیش کر رہے ہیں وہ کہاں تک صحیح دلیل ہے؟ اس پر بعد میں گفتگو کی جائے گی۔ سر دست ہمیں ان کے اس

اندازِ بیان اور طرزِ کلام کے حوالے سے کچھ عرض کرنا ہے جو اُنہوں نے سنت کا مطلب بیان کرتے ہوئے اختیار فرمایا ہے: ''سنت سے ہماری مراد یہ ہے...... ''

غامدی صاحب کو یاد رکھنا چاہیے کہ 'سنت' ایک اسلامی شرعی اصطلاح ہے جو اپنا ایک مسلمہ اور متعین مفہوم رکھتی ہے۔ یہ دینی اصطلاح کسی کی ذاتی جاگیر نہیں کہ کوئی شخص اٹھ کر اپنے جی سے جو چاہے اس سے مراد لیتا پھرے۔ معاف کیجئے، یہ اندازِ کلام اس طرح کا ہے جیسے کوئی سر پھرا شخص یوں دعویٰ کرے۔

- نماز (اقامت صلوٰۃ) سے ہماری مراد دین موسوی کی وہ روایت ہے۔
- روزے (صوم) سے ہماری مراد دین عیسوی کی وہ روایت ہے۔
- حج سے ہماری مراد دین سلیمانی کی وہ روایت ہے۔
- زکوٰۃ سے ہماری مراد دین داؤدی کی وہ روایت ہے۔
- صحیح حدیث سے ہماری مراد وہ خبر یا اطلاع ہے جو کبوتر یا ہُد ہُد کے ذریعے موصول ہو۔
- مجتہد سے ہماری مراد ایسا شخص ہے جو انتہائی کوشش اور جدوجہد کے بعد ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ جائے۔
- فقہ سے ہماری مراد وہ علم ہے جو کسی شخص کو بگلے کی طرح پانی میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر غور و فکر کرنے کے بعد حاصل ہو۔
- مفتی سے ہماری مراد وہ آدمی ہے جو سرکاری خرچ پر مفت حج کر کے آئے۔
- امیر المومنین سے ہماری مراد وہ شخص ہے جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ دولت مند ہو۔
- خلیفہ سے ہماری مراد لکھنؤ کا حجام ہے۔

کیا ایسے سر پھرے شخص کے ان دعاوی کو کوئی معقول آدمی تسلیم کر سکتا ہے؟ کیا ایک مسلمان معاشرے میں اس طرح کے تلعب بالدین اور اسلامی اصطلاحات سے کھیل مذاق کی اجازت دی جا سکتی ہے؟ غامدی صاحب! ہوش کے ناخن لیں۔ آپ یہ لوگوں کو دین سمجھا رہے ہیں یا اپنی ہوائے نفس کا اظہار فرما رہے ہیں؟ ؏

تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے؟

دین کی اصطلاحات کے مسلمہ معانی و مفاہیم بدلنا ہمارے ہاں کے منکرین حدیث کی پرانی عادت ہے۔ مشہور منکر حدیث پرویز صاحب نے بھی بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے اپنی تحریروں میں یہ حربہ اختیار کیا ہے۔ اُنہوں نے صلوٰۃ، زکوٰۃ، جنت، جہنم، جنات، آدم، ملائکہ، حتیٰ کہ اللہ و رسول کے مسلمہ اصطلاحی مطالب بدل ڈالے جس کے سبب متحدہ پاکستان کے ڈیڑھ ہزار علمائے کرام اپنے دستخطوں کے ساتھ اُن پر کفر کا فتویٰ لگانے پر مجبور ہوئے۔

دینی اصطلاحات کے مسلمہ معنی و مفہوم کو بدل ڈالنا ایک عظیم گمراہی ہے، شرارت ہے، فتنہ ہے اور الحاد و زندقہ ہے۔ خود غامدی صاحب کے اُستاد اور اُستاذ الاستاذ جن کا شاگرد کہلانا وہ اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں اور جن کی فکر کے وہ علمبردار بنتے ہیں، ایسی شنیع حرکت کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر تدبر قرآن کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''اُمت کے جس تواتر نے قرآنِ کریم کو ہم تک منتقل کیا ہے، اسی تواتر نے دین کی تمام اصطلاحات کا عملی مفہوم بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر فرق ہے تو یہ فرق ہے کہ ایک چیز قولی تواتر سے منتقل ہوئی ہے، دوسری چیز عملی تواتر سے۔ اس وجہ سے اگر قرآن مجید کو ماننا ہم پر واجب ہے تو ان ساری اصطلاحات کی اس عملی صورت کو ماننا بھی واجب ہے جب سلف سے خلف تک بالتواتر منتقل ہوئی ہیں۔''

(مقدمہ تدبر قرآن: جلد اول، ص 29، مطبوعہ 1983ء)

پھر دینی اصطلاحات کے مطالب بدلنے کو مولانا اصلاحی منکرین حدیث کی جسارت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور عمرہ و قربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور اُمت کے تواتر نے ان کی جو شکل ہم تک منتقل کی ہے، اس میں ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغیر کرنا چاہتے ہیں، صریحاً خود قرآنِ مجید کے انکار کے مترادف ہے۔ اس لیے کہ جس تواتر نے ہم

تک قرآن کو منتقل کیا ہے، اسی تواتر نے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر وہ اُن کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کو ماننے کے لیے بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ اصطلاحات کے معاملے میں تنہا لغت پر اعتماد بھی ایک بالکل غلط چیز ہے۔" (مقدمہ تدبر قرآن، جلد اوّل، ص 29، مطبوعہ 1983ء)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا اصلاحی کے نزدیک کسی دینی اصطلاح کے معنی بدلنے کا مطلب اس کا انکار ہے۔ اس بنا پر غامدی صاحب کا سنت کی اصطلاح کے معنی بدلنا سنت کا انکار ہے۔ اس لیے وہ اپنے استاد کے اُصول کے مطابق منکرِ حدیث و سنت قرار پاتے ہیں۔

آگے چل کر مولانا اصلاحی نے اس بارے میں اپنے اُستاد مولانا فراہی رحمہ اللہ کا یہ مسلک لکھا ہے کہ:

"ان دینی اصطلاحات کے بارے میں مولانا فراہی رحمہ اللہ اپنے مقدمہ تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اسی طرح تمام اصطلاحاتِ شرعیہ مثلاً نماز، زکوٰۃ، جہاد، روزہ، حج، مسجد حرام، صفا، مروہ اور مناسک حج وغیرہ اور اُن سے جو اعمال متعلق ہیں، تواتر و توارث کے ساتھ سلف سے لے کر خلف تک سب محفوظ رہے۔ اس میں جو معمولی جزوی اختلافات ہیں وہ بالکل ناقابل لحاظ ہیں...... پس جب ایسے اصطلاحی الفاظ کا معاملہ پیش آئے جن کی پوری حد و تصویر قرآن میں نہ بیان ہوئی تو صحیح راہ یہ ہے کہ جتنے حصے پر تمام اُمت متفق ہے، اتنے پر قناعت کرو۔"

(مقدمہ تدبر قرآن: جلد اوّل ص 29، 30، مطبوعہ 1983ء)

میں نے اس مقام پر دانستہ طور پر مولانا اصلاحی اور مولانا فراہی کی تحریروں کے اقتباسات دیے ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے غامدی صاحب پوری امت مسلمہ میں سے صرف انہی دو حضرات کو علما سمجھتے ہیں اور ان کو آسمان کا درجہ دیتے ہیں۔ باقی علمائے امت کو وہ خاک کے برابر سمجھتے ہیں جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب مقامات میں لکھا ہے:

"میں نے بھی بہت عالم دیکھے، بہتوں کو پڑھا اور بہتوں کو سنا لیکن امین احسن

اور اُن کے استاد حمید الدین فراہی کا معاملہ وہی ہے کہ

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت"

(مقامات: صفحہ 57، 58، طبع دسمبر 2001ء، لاہور)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غامدی صاحب ان دونوں حضرات کے مسلک کے خلاف بھی اپنے کچھ ذاتی نظریات رکھتے ہیں اور محض مفاد کے حصول کے لیے ان حضرات سے اپنی شاگردی کا دعویٰ کرتے، ان سے نسبت جوڑتے اور ان کا نام غلط طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ عورت کے پردہ، مجسمہ سازی، موسیقی، داڑھی، عورت کی امامت، جہاد، مسئلہ تکفیر، یاجوج ماجوج اور غیر مسلم سے عورت کا نکاح جیسے بیسیوں مسائل و اُمور ہیں جن میں شاگرد کا اپنے اُستادوں سے اختلاف ہے۔ پھر نہ صرف مسائل میں بلکہ اُصول دین میں بھی واضح اختلاف موجود ہے۔

اصل بحث:

غامدی صاحب نے سنت کی ابتدا سیّدنا ابراہیم علیہ السلام سے کی ہے جبکہ سنت کی ابتدا تمام علمائے اُمت کے نزدیک سیّدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوتی ہے، اسی لیے اسے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے نہ کہ...... دین ابراہیمی کی روایت۔

سنت کا خودساختہ مفہوم لینے کے لیے غامدی صاحب سورۃ النحل کی درج ذیل آیت پیش کرتے ہیں:

﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۝﴾ (النحل: 123)

"پھر ہم نے (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) تمہاری طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کرو جو یکسو تھے اور شرک کرنے والے نہ تھے۔"

مگر اس آیت سے غامدی صاحب نے جو استدلال کیا ہے، وہ قرآن کی معنوی تحریف

کے زمرے میں آتا ہے، کیونکہ:

1۔ مذکورہ آیت میں بلاشبہ مِلَّةَ إِبْرٰهِيْمَ یعنی دین ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا ہے کیونکہ مِلَّةَ کے معنی دین کے ہیں۔ مگر اس آیت سے دین ابراہیم علیہ السلام کی روایت کیسے برآمد ہوگئی؟ اور یہ کس چڑیا کا نام ہے......؟ اس روایت کا مفہوم اس آیت کے کس لفظ سے نکلتا ہے؟

2۔ مذکورہ آیت میں بے شک نبی ﷺ کو ملت ابراہیم یعنی دین ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے مگر اس آیت میں یہ بات کہاں ہے کہ اس کی پیروی کرتے ہوئے نبی ﷺ اس دین ابراہیم کی تجدید و اصلاح بھی فرمائیں، اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کردیں، اور پھر جو کچھ تیار ہو جائے، اسے اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمادیں؟''

یہ سارا مفہوم غامدی صاحب کے اپنے ذہن کی اُپج ہے جسے اُنہوں نے آیت کی طرف منسوب کردیا ہے۔ انہوں نے اپنے ذاتی خیالات کو قرآنِ مجید کی عبارت میں پڑھنے کی بہت بُری مثال قائم کردی ہے جو ٹھیک ٹھیک مذموم تفسیر بالرائے اور قرآن کی معنوی تحریف ہے۔

قرآنی آیات کی معنوی تحریف کر کے ان سے اپنے من پسند نظریات برآمد کرنا دوسرے منکرین حدیث کی طرح غامدی صاحب کی بھی عادت ہے۔ اس حوالے سے ہم نے بہت سی مثالیں اپنی کتاب ''غامدی مذہب کیا ہے؟'' میں پیش کردی ہیں۔

آیت میں مِلَّةَ کا لفظ آیا ہے جس کے معنی دین اور مذہب کے ہیں۔ مشہور عربی لغت لسان العرب میں ہے:

"الملة: الدين كملة الاسلام والنصرانية واليهودية."

(لسان العرب از ابن منظور: زیر مادہ ملل)

''ملت کے معنی دین کے ہیں جیسے دین اسلام، نصرانیت (عیسائیت) کا دین، یہودیت کا دین۔''

قرآن مجید میں بھی مِلَّةَ کا لفظ دین اور مذہب کے معنوں میں آیا ہے، مثال کے طور پر

درج ذیل آیات ملاحظہ ہوں:

1: ﴿وَلَنْ تَرْضٰی عَنْكَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾ (البقرہ : 120)

''اور یہودی اور عیسائی تجھ سے اُس وقت تک راضی نہ ہوں گے جب تک تو اُن کا مذہب اختیار نہ کرے۔''

2: قومِ شعیب علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ ○ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا﴾ (الاعراف : 89-89)

''اُس کی قوم کے متکبر سرداروں نے کہا: اے شعیب علیہ السلام! ہم تمہیں اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے یا تمہیں ہمارے مذہب میں واپس آنا ہوگا۔ شعیب علیہ السلام نے کہا: اگر ہم تمہارے مذہب سے بیزار ہوں تو کیا پھر بھی تمہاری بات مان لیں۔ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر ہم تمہارے مذہب میں لوٹ آئیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچا چکا ہے۔''

3: ایک مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ اپنے بارے میں یہ کہیں:

﴿قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○﴾ (الانعام: 161)

''کہہ دیجیے کہ میرے ربّ نے مجھے سیدھا راستہ بتادیا ہے۔ وہی صحیح دین جو ابراہیم علیہ السلام کا دین تھا جو کہ موحد تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔''

واضح ہوا کہ اس جگہ صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ کا بدل ہے: دِیْنًا قِیَمًا اور اُس کا بدل ہے

مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ اور تینوں کا مطلب ہے دین اسلام!

4: ﴿وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرٰهِمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ﴾ (البقرہ: 130)

''اور ایسا کون ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے دین سے منہ موڑے؟ سوائے اس شخص کے جس نے اپنے آپ کو احمق بنالیا ہو۔''

مذکورہ آیات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مِلَّةَ کے معنی دین اور مذہب کے ہیں مگر غامدی صاحب نے مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ کے معنی ابراہیم علیہ السلام کا دین، لینے کی بجائے اس کے معنی دین ابراہیم کی روایت کر کے دوسروں کو مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح وہ جس آیت سے اپنی سنت (دین ابراہیم کی روایت) کا مفہوم کشید کرتے ہیں، اس میں سرے سے یہ معنی موجود نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام انبیائے کرام کا دین تو ایک ہی تھا مگر شریعتیں الگ الگ تھیں، اس کی دلیل خود قرآن مجید میں ہے:

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ (المائدہ: 48)

''ہم نے تم میں سے ہر اُمت کے لیے الگ شریعت اور طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر اللہ چاہتا تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔''

غامدی صاحب کے اُستاد مولانا امین اصلاحی بھی اس حقیقت کو مانتے ہیں کہ تمام نبیوں اور اُن کی امتوں کے لیے ایک ہی دین تھا لیکن سب کی شریعت الگ الگ تھی۔ چنانچہ وہ مذکورہ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے ''مختلف اُمتوں کی شریعت کے اختلاف کی حکمت'' کے عنوان کے ساتھ لکھتے ہیں کہ

''جہاں تک دین کے حقائق کا تعلق ہے، وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر ہی رہیں گے لیکن شریعت کے ظواہر و رسوم ہر اُمت کے لیے اللہ تعالیٰ نے الگ الگ مقرر فرمائے تاکہ یہ چیز اُمتوں کے امتحان کا ذریعہ بنے۔''

(تدبر قرآن: جلد دوم، ص 535، مطبوعہ 1983ء، لاہور)

قرآن نے یہ حقیقت کئی مقامات پر واضح کی ہے کہ تمام انبیائے کرام کا ایک ہی دین تھا۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا کہ سیّدنا محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کے لیے وہی دین مقرر ہے جو سیّدنا نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا دین تھا اور اسی دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ (الشوریٰ: 13)

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح علیہ السلام کو حکم دیا تھا اور اے نبی ﷺ! اسی دین کی وحی ہم نے آپ ﷺ کی طرف کی ہے اور اسی پر چلنے کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو دیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

ایک اور مقام پر اٹھارہ انبیائے سابقین (نوح، ابراہیم، اسحٰق، اسمٰعیل، یعقوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، داؤد، سلیمان، ایوب، زکریا، یحییٰ، الیاس، الیسع، یونس، لوط اور عیسیٰ علیہم السلام) کا ذکر کر کے نبی ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ ان کی ہدایت یعنی دین کی پیروی کریں۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَآءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ o اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ﴾ (الانعام: 89-90)

''یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب دی، حکومت بخشی اور نبوت عطا کی۔ اب اگر یہ لوگ (مکے والے قریش) ہماری نعمتوں کی ناشکری کرتے ہیں تو ہم نے ان کی بجائے ایسے لوگ مقرر کر دیے ہیں جو ان نعمتوں کی ناشکری کرنے والے

نہیں۔ (اے نبی ﷺ!) پہلے نبیوں کو بھی اللہ نے ہدایت بخشی، لہٰذا آپ ﷺ بھی ان کی ہدایت (دین) کی پیروی کریں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ صرف ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ تمام انبیائے کرام کی ہدایت اور دین کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ سب کا دین ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے جو سراپا ہدایت ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک صحیح اور سچا دین بھی صرف اسلام ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران: 19)

"بے شک اللہ کے نزدیک (سچا) دین صرف اسلام ہے۔"

بلکہ یہاں تک فرما دیا کہ آخرت میں صرف دین اسلام مقبول دین ہوگا اور اس کے سوا کوئی اور دین مقبول نہ ہوگا۔

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (آل عمران: 85)

"اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کے دین کو ہرگز قبول نہ کرے گا اور وہ شخص آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔"

تمام انبیائے کرام کا دین اسلام رہا اور سب کی تعلیمات میں درج ذیل اُمور مشترک تھے۔ وجودِ باری تعالیٰ، عقیدۂ توحید، عقیدۂ نبوت و رسالت، عقیدۂ آخرت، فرشتوں پر ایمان، آسمانی کتب پر ایمان، ایک اللہ کی عبادت (نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی وغیرہ)، حقوق العباد (جیسے والدین سے حسن سلوک) اور اچھے اخلاق (جیسے سچ بولنا، جھوٹ نہ بولنا وغیرہ)

گویا سب کے ہاں اسلام کے بنیادی عقائد و اعمال یکساں تھے، لیکن سب کی شریعتیں جدا جدا تھیں۔ حتیٰ کہ قبلہ تک مختلف تھا جس کی طرف نماز پڑھنے سے ان کی نماز درست ہوسکتی تھی:

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (البقرہ: 148)

"اور ہر مذہبی گروہ کا اپنا ایک قبلہ ہے جس کی طرف منہ کر کے وہ عبادت کرتا

ہے مگر تم لوگ نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔"

ان تمام تصریحات کے بعد یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ سورۃ النحل کی مذکورہ آیت میں سیّدنا محمد ﷺ کو جس دینِ ابراہیمی کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ وہی دین ہے جو تمام انبیائے کرام کا مشترکہ دین ہے۔ اس میں صرف دینِ ابراہیمی کی خصوصیت یا تخصیص نہیں ہے کیونکہ قرآن میں دوسرے انبیائے کرام کا ذکر کر کے ان کی ہدایت اور دین کی اقتدا اور پیروی کرنے کا حکم بھی نبی کریم ﷺ کو دیا گیا ہے۔ مگر غامدی صاحب دینِ ابراہیمی کو جو تمام انبیائے کرام کا دین ہے اس کو پہلے دینِ ابراہیمی کی روایت کا نام دیتے ہیں اور پھر اسے سنت کا نام دے ڈالتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ سیّدنا محمد ﷺ کی بعثت کے وقت مکے میں دینِ ابراہیمی کی کون سی روایت موجود تھی جس کی پیروی کا حکم آپ ﷺ کو دیا گیا تھا؟ وہاں تو قریش کی وہ حالت تھی جسے دورِ جاہلیت کہا جاتا ہے اور وہ لوگ تو شرک، بت پرستی، گمراہی اور اوہام پرستی میں مبتلا تھے۔ جاہلیت کے جو معاشرے توحید کا بنیادی عقیدہ چھوڑ چکے تھے، اس کے ہاتھوں میں دینِ ابراہیمی کی کون سی روایت اپنی اصل میں محفوظ تھی؟ جو قوم سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کے سیدھے سادے اور واضح عقیدۂ توحید کی حفاظت نہیں کر سکی تھی اُس کے ہاتھوں میں دینِ ابراہیمی کی کون سی روایات محفوظ رہ گئی تھیں؟ اگر دینِ ابراہیمی کی روایت سے مراد یہ ہے کہ سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا جو دین چلا آ رہا تھا تو یہ بات حقیقت کے سراسر خلاف ہے کیونکہ ان کا دین اپنی اصلی صورت میں سیّدنا محمد ﷺ کے زمانے تک محفوظ نہیں رہا۔ تاریخِ عرب سے واقف کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک نبی کے بتائے ہوئے دین میں جب بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور قوم اصل دین کو فراموش کر بیٹھتی ہے تو اس دین کی یاددہانی کے لیے نئے نبی کی بعثت ہوتی ہے، لیکن اگر پہلے نبی کے دین کی روایت اپنی اصلی حالت میں موجود اور محفوظ ہو تو پھر کسی نئے نبی کی بعثت کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ سیّدنا محمد ﷺ کی بعثت کے

وقت نہ صرف ابراہیم علیہ السلام کے دین میں بگاڑ آ چکا تھا بلکہ اُن کے بعد آنے والے انبیائے کرام سیدنا موسیٰ علیہ السلام اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو بھی لوگ بھلا بیٹھے تھے جبھی تو اس کی دعوت و تبلیغ کے لیے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا۔

اب اگر غامدی صاحب کے اس دعوے کو صحیح مان لیا جائے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے دین کی روایت اجماع اور تواتر کے ساتھ عرب کے دورِ جاہلیت میں بھی موجود تھی تو ایسی صورت میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟

پھر سورۃ النحل کی مذکورہ آیت میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کی پیروی کا حکم نہیں دیا گیا، کیونکہ ایک تو ان دونوں انبیا کی شریعتیں الگ الگ ہیں، دوسرے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کا عرب میں کوئی وجود نہ تھا جس کی پیروی کا حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا جاتا۔

اس لیے یہ بات قرآن مجید سے کہیں ثابت نہیں ہوتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین ابراہیمی کی روایت میں پہلے وحی یا اجتہاد سے تجدید و اصلاح فرمائیں، پھر اس میں کچھ اضافے کر دیں اور آخر میں اسے اپنے ماننے والوں پر دین کی حیثیت سے جاری فرماتے ہوئے اس کا نام سنت رکھ دیں۔

غامدی صاحب کو ہمارا چیلنج ہے کہ وہ سنت کی جو تعریف فرما رہے ہیں اور اس کا جو مفہوم مراد لے رہے ہیں، سنت کی یہی تعریف اور یہی مفہوم وہ پوری اُمت میں سے کسی ایک محدث، فقیہ یا مجتہد کے ہاں دکھا دیں اور اگر ان کی اس نادر فکر اور نرالے اجتہاد سے امت کا کوئی صاحب علم متفق نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو وہ اسلامی اصطلاحات کے مفاہیم بگاڑنے کا ٹھیکہ نہ لیں۔ خود گمراہ نہ ہوں اور نہ دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ سبیل المؤمنین اور اجماعِ امت کی راہ اختیار کریں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ چونکہ غامدی صاحب:

1. سنت کی ابتدا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ماننے کی بجائے سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے مانتے ہیں۔

② سنت کو تنہا نبی کریم ﷺ کی روایت قرار دینے کی بجائے دو انبیائے کرام (سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیّدنا محمد ﷺ) کی مشترکہ روایت قرار دیتے ہیں۔

③ سنت کی اسلامی اصطلاح کی متفقہ اور مسلمہ اجماعی تعریف اور مفہوم...... یعنی شریعت کے وہ احکام جو رسول اللہ ﷺ کے قول، فعل یا تقریر (خاموش تائید) کے ذریعے ثابت ہوں...... کو چھوڑ کر اس کی وہ من گھڑت اور خود ساختہ تعریف کرتے ہیں اور اس سے اپنا من پسند مفہوم نکالتے ہیں۔

اس لیے وہ ہمیں منکرین حدیث کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں اور ہمارے زمانے کے منکرین حدیث اب اُن کو اپنی صف میں پا کر بڑی مسرت کا اظہار کرتے پھرتے ہیں۔



باب نمبر 2:

کیا سنت کا تعلق صرف عمل سے ہے؟

غامدی صاحب جن مختلف طریقوں سے حدیث کا انکار کرتے ہیں اُن میں ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ پہلے حدیث اور سنت میں فرق کرتے ہیں اور حدیث کو سنت سے الگ کر دیتے ہیں۔ پھر سنت کے ثبوت کے لیے اجماع اور تواتر کی شرط لگاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ سنت کو چند اعمال (ستائیس 27 اعمال) میں محصور و محدود مانتے ہیں اور آخر میں یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ دین صرف قرآن کا اور سنت کے ان چند اعمال کا نام ہے۔ ان کے سوا اور کوئی چیز دین نہیں ہے۔ اس طرح وہ حدیث کو دین سے خارج کر کے منکرین حدیث کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں اور دین کا ایک نیا ایڈیشن تیار کر کے متجددین کے گروہ سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس سلسلے میں اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

> ''دوسرا اصول یہ ہے کہ سنت کا تعلق تمام تر عملی زندگی سے ہے، یعنی وہ چیزیں جو کرنے کی ہیں۔ علم و عقیدہ، تاریخ، شانِ نزول اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لغت عربی میں سنت کے معنی پٹے ہوئے راستے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قوموں کے ساتھ دنیا میں جزا و سزا کا جو معاملہ کیا، قرآن میں اسے ''سنۃ اللہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سنت کا لفظ ہی اس سے اِبا کرتا ہے کہ ایمانیات کی قسم کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے۔ لہٰذا علمی نوعیت کی کوئی چیز بھی سنت نہیں ہے۔ اس کا دائرہ کرنے کے کام ہیں، اس دائرے سے باہر کی چیزیں اس میں کسی طرح شامل نہیں کی جا سکتیں۔''

(میزان، ص 58، طبع سوم 2008ء، لاہور)، (اصول و مبادی، ص 65، طبع دوم، فروری 2005ء، لاہور)

اپنے اس اصول کی بنا پر غامدی صاحب نے سنت کے تمام اعمال کو جمع کیا ہے جن کی کل تعداد ستائیس (27) ہے اور پھر ان میں قرآن کو شامل کر کے وہ اپنا دین مکمل کر لیتے ہیں۔ اس طرح اُن کا کل دین صرف قرآن پر اور درج ذیل (27) اعمال پر، جن کو وہ سنت کہتے ہیں، مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ اور کسی چیز کو خواہ وہ صحیح حدیث یا کوئی اور سنت ہی کیوں نہ ہو، اُسے وہ دین کے طور پر نہیں مانتے۔

چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ سے یہ دین (اسلام) آپ کے صحابہ کے اجماع اور قولی و عملی تواتر سے منتقل ہوا اور دو صورتوں میں ہم تک پہنچا ہے:

(1) قرآن مجید (2) سنت

(میزان، ص 13، طبع سوم، مئی 2008، لاہور)

اس کے بعد سنت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اُس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ قرآن میں آپ کو ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ روایت بھی اُسی کا حصہ ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

﴿ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرٰهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ (النحل: 123)

''پھر ہم نے تمہیں وحی کی کہ ملت ابراہیم کی پیروی کرو جو بالکل یکسو تھا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔''

اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا، وہ یہ ہے:

عبادات:

(1) نماز۔ (2) زکوٰۃ اور صدقہ فطر۔ (3) روزہ و اعتکاف۔ (4) حج و عمرہ۔
(5) قربانی اور ایامِ تشریق کی تکبیر۔

معاشرت:

(1) نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات۔ (2) حیض و نفاس میں زن و شو کے تعلق سے اجتناب۔

خورد و نوش:

(1) سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت۔ (2) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔

رسوم و آداب:

(1) اللہ کا نام لے کر اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے موقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) مونچھیں پست رکھنا۔ (6) زیر ناف کے بال مونڈنا۔ (7) بغل کے بال صاف کرنا۔ (8) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (9) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (10) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ (11) استنجا۔ (12) حیض و نفاس کے بعد غسل۔ (13) غسلِ جنابت۔ (14) میت کا غسل۔ (15) تجہیز و تکفین۔ (16) تدفین۔ (17) عید الفطر۔ (18) عید الاضحیٰ۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں مسلمانوں کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔"

(میزان، ص 14، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

قرآن اور سنت کی یہ مخصوص وضاحت کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:

''دین لاریب، انہی دو صورتوں میں ہے۔ ان کے علاوہ کوئی چیز دین ہے، نہ اسے دین قرار دیا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار و آحاد جنہیں بالعموم حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی درجہ یقین کو نہیں پہنچتا۔ اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔''

(میزان، ص 15، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

1۔ کیا سنت صرف اعمال کا نام ہے؟

اب ہم غامدی صاحب کے اس تصور سنت پر تبصرہ کریں گے۔

جب غامدی صاحب صرف اعمال ہی کو سنت سمجھتے ہیں اور قرآن اور ستائیس (27) اعمال پر مشتمل سنت کے اس پیکیج ہی کو پورا دین قرار دیتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے بعد ایسی سینکڑوں بلکہ ہزاروں صحیح احادیث کا انکار ہو جاتا ہے جن کو امت مسلمہ آج تک سنت اور دین کا حصہ سمجھ کر ان پر عمل کرتی رہی ہے کیونکہ امتِ مسلمہ کے نزدیک سنت کی اصطلاح کا مفہوم درج ذیل ہے:

"فامّا السّنة فهي اقوال النبي ﷺ وافعاله وتقريراته وصفاته."

(اصول الفقه الاسلامي، لدكتور وهبه زُهيلي ج١، ص ٤٤٩)

''سنت نام ہے نبی ﷺ کے اقوال، افعال، تقریرات و تائیدات اور صفات کا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ سنت کی اصطلاح کا مسلمہ مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے وہ احکام جو نبی کریم ﷺ کے قول، فعل یا تقریر (خاموش تائید) یا صفات سے ثابت ہوں۔

:1 "إِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّات." (صحیح بخاری: 1)

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔''

:2 "اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِيْمَان." (صحیح بخاری، : 24، صحیح مسلم، : 59)

''حیا ایمان کا حصہ ہے۔''

3: "أَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ ." (سنن ابی داؤد، 4252، صحیح بخاری: 3535)

''میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔''

4: "لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ ." (ابو داؤد: 2870)

''وارث کے لیے وصیت نہیں ہوسکتی۔''

5: "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ ." (ابن ماجه: 224)

''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''

6: "وَعُوْدُوا الْمَرِيْضَ ." (صحیح بخاری: 1240)

''اور مریض کی عیادت کرو۔''

7: "نُهِيْنَا اَنْ نُحِدَّ اَكْثَرَ مِنْ ثَلَاثٍ اِلَّا بِزَوْجٍ ." (صحیح بخاری: 1279)

''ہمیں تین دن سے زیادہ میت کا سوگ کرنے سے منع کیا گیا ہے سوائے شوہر کے سوگ کے۔''

8: "حُرِّمَ لِبَاسُ الْحَرِيْرِ وَالذَّهَبِ عَلٰى ذُكُوْرِ أُمَّتِيْ ."

(ترمذی: 1720، صحیح بخاری: 5833

''میری اُمت کے مردوں کے لیے ریشم اور سونا پہننا حرام کیا گیا ہے۔''

9: "لَا يَبِيْعُ اَحَدُكُمْ عَلٰى بَيْعِ اَخِيْهِ ." (صحیح بخاری: 2139، صحیح مسلم: 3454

''کسی کے سودے پر سودا نہ کرو۔''

10: "لَا يَخْطِبُ عَلٰى خِطْبَةِ اَخِيْهِ ." (صحیح بخاری: 2139، صحیح مسلم: 3454)

''کسی کی منگنی پر منگنی نہ کرو۔''

11: "كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ ، فَزُوْرُوْهَا ." (صحیح مسلم: 2260)

''میں نے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا لیکن اب تم ان کی زیارت کیا کرو۔''

12: "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ." (ابو داؤد: 5128)

"جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے۔"

13: "لَا يَقْضِيَنَّ حَكَمٌ بَيْنَ اثْنَيْنِ وَهُوَ غَضْبَانُ."

(صحیح بخاری: 7158، صحیح مسلم: 4490)

"دو آدمیوں کے درمیان فیصلہ کرنے والا غصے کی حالت میں ہرگز فیصلہ نہ کرے۔"

14: "إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ."

(صحیح بخاری: 7352، صحیح مسلم: 4487)

"جب کوئی حاکم فیصلہ کرے اور درست اجتہاد کرے تو اس کے لیے دگنا اجر ہے۔"

15: "لَا يَتَمَنَّى أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ." (صحیح بخاری: 5671، صحیح مسلم: 6819)

"تم میں سے کوئی شخص موت کی تمنا نہ کرے۔"

16: "أُذْكُرُوا مَحَاسِنَ مَوْتَاكُمْ." (ابو داؤد حدیث: 4900، ترمذی: 1019)

"مردوں کی خوبیاں بیان کرو۔"

17: "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ." (صحیح بخاری: 893)

"تم میں سے ہر ایک نگران اور ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اُس کے ماتحت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

18: "إِدْرَءُوا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِيْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ." (ترمذی: 1424)

"جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو حدود سے بچانے کی کوشش کرو۔"

19: "اَلْعَيْنُ حَقٌّ." (صحیح بخاری: 5740، صحیح مسلم: 5701)

"نظر لگ جاتی ہے۔"

20: "إِنَّ إِبْرَاهِيْمَ حَرَّمَ مَكَّةَ وَإِنِّيْ حَرَّمْتُ الْمَدِيْنَةَ."

(صحیح مسلم: 3317، صحیح بخاری: 1867)

"بے شک ابراہیم علیہ السلام نے مکے کو حرام قرار دیا اور میں نے مدینے کو حرام

دیا۔''

غامدی صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ صرف اعمال کو سنت مانتے ہیں اور پھر سنت کو فقط ستائیس (27) اعمال میں محصور و محدود کر لیتے ہیں تو اس کے نتیجے میں مذکورہ بالا جیسی ہزاروں قولی و فعلی سنتوں کا اور سینکڑوں مسنون دعاؤں کے سنت ہونے کا انکار کر کے وہ منکرین حدیث کی صف میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔

2۔ سنت سے کیا مراد ہے؟

غامدی صاحب سنت کا اصطلاحی مفہوم بدلنے کے لیے اُس کی لغوی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''لغت عربی میں سنت کے معنی پٹے ہوئے راستے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قوموں کے ساتھ دنیا میں جزا و سزا کا جو معاملہ کیا، قرآن میں اسے ''سنۃ اللہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سنت کا لفظ ہی اس سے اِبا کرتا ہے کہ ایمانیات کی قسم کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے۔'' (میزان، ص 58، طبع سوم 2008ء، لاہور)

اوّل تو اصول حدیث میں سنت کی اصطلاح کی لغوی بحث کرنا اور اسے دلیل بنانا ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔ لیکن غامدی صاحب نے اس کی جو نادر لغوی تحقیق فرمائی ہے اس کا جائزہ لینا بھی ہمارے لیے ضروری ہے۔

انہوں نے بغیر کسی معتبر لغت کا حوالہ دیے یہ دعویٰ کیا ہے کہ لغت عربی میں سنت کے معنی پٹے ہوئے راستے کے ہیں۔ حالانکہ یہ معنی عربی میں لفظ سنت کے نہیں بلکہ لفظ مؤطا کے ہیں۔ سنت کے اصل لغوی معنی طریقے اور حالت کے ہیں۔

عربی زبان کے نہایت مستند لغت ''لسان العرب'' میں سنت کے لفظ کی درج ذیل وضاحت کی گئی ہے:

"وقد تكرر في الحديث ذكر السُّنَّة وما تصرف منها، والأصل فيه الطريقة والسِّيرَة، واذا أُطلقت في الشرع فإنما يراد بها ما

أَمَرَ به النبيُّ ﷺ، وَنهى عنه ونَدَب اليه قولًا وفعلًا مما لم يَنْطق بـه الكتابُ العزيز، ولهذا يقال في أدلة الشرع: الكتابُ والسُّنَّةُ أي القرآن والحديث."

(لسان العرب از ابن منظور، تحت سنن جلد 13، ص 225)

"حدیث کے حوالے سے سنت اور اُس سے متعلقہ امور کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اصل میں اس (سنت) کے معنی طریقے اور حالت کے ہیں۔ شرعی طور پر اس لفظ کا اطلاق ایسے امور پر ہوتا ہے جن کے بارے میں کتاب عزیز یعنی قرآن تو خاموش ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کے بارے میں قولی یا فعلی طور پر کوئی حکم دیا، یا جس سے منع فرمایا، یا جسے پسند فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ مصادرِ شریعت کے لیے کتاب و سنت کے الفاظ بولے جاتے ہیں جن کا مطلب ہوتا ہے قرآن و حدیث۔"

اس سے معلوم ہوا کہ عربی لغت میں سنت کے معنی غامدی صاحب کے دعویٰ کے مطابق پٹے ہوئے راستے کے نہیں ہیں بلکہ طریقہ اور حالت کے ہیں۔

غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی بھی سنن (سنت کی جمع) سے مراد ضابطے اور قاعدے لیتے ہیں۔ "پٹے ہوئے راستے" مراد نہیں لیتے۔ چنانچہ وہ اپنی تفسیر "تدبر قرآن" میں سورۂ آل عمران کی درج ذیل آیت 137 ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ۝﴾ "تم سے پہلے بہت سی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں پس تم زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔" کی تفسیر کرتے ہوئے لفظ سنن (سنت کی جمع) پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سنن سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کے تحت وہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ ایک قوم اگر اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی تعمیل اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو

برومند اور کامیاب کرتا ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی قوم خدا کے احکام وقوانین کی نافرمانی اور اس کے رسولوں کی تکذیب کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کردیتا ہے۔"
(تدبر قرآن، جلد 2، ص178، طبع مئی 1983ء، لاہور)

اس سے واضح ہے کہ سنت کے لغوی معنی قاعدے طریقے اور ضابطے کے ہیں اور یہ قاعدے طریقے اور ضابطے اعمال کا نام نہیں ہے بلکہ اقوال اور علمی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ خود پٹا ہوا راستہ بھی کوئی عملی چیز نہیں ہوتا۔ مال روڈ کسی عمل کا نام نہیں ہے جسے غامدی صاحب سنت کو عمل ثابت کرنے کے لیے دلیل بنا رہے ہیں۔

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ سنت کا لفظ ہی اس سے ابا کرتا ہے کہ ایمانیات کی قسم کی کسی چیز پر اس کا اطلاق کیا جائے۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ سنت کے ذریعے بہت سے اسلامی عقائد اور ایمانیات ثابت ہوتے ہیں جیسے تقدیر پر ایمان لانا۔ قبر کا عذاب ہونا، ختم نبوت کا عقیدہ، آخرت میں نبی کریم ﷺ کی شفاعت کبریٰ، فرشتوں کا نور سے پیدا ہونا وغیرہ سب عقائد وایمانیات سنت ہی کے ذریعے ثابت ہوتے ہیں اور ان کی بنیاد صرف سنت پر ہے۔

اسی طرح کسی غیر مسلم کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنے کے لیے اُسے کلمہ طیبہ کی گواہی دلانا صرف اور صرف سنت ہی سے ثابت ہے اور یہ ایمانیات میں سے بھی ہے، اقوال میں سے بھی ہے اور یہ علمی نوعیت کی چیز بھی ہے۔

لہٰذا غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ سنت کا تعلق صرف اعمال سے ہوتا ہے اور علمی نوعیت یا ایمانیات کی کوئی چیز اس سے مراد نہیں لی جا ئی۔



باب نمبر 3:

کیا سنت کے ثبوت کے لیے اجماع اور تواتر شرط ہے؟

سنت کا شرعی و اصطلاحی مفہوم چھوڑ کر غامدی صاحب پہلے تو اپنے جی سے اُس کا ایک نرالا مفہوم گھڑ لیتے ہیں اور پھر اس کے ثبوت کے لیے انوکھی شرطیں عائد کرتے ہیں۔ان کے نزدیک سنت کا ثبوت خبرِ واحد سے نہیں ہوتا بلکہ اس کا ثبوت بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ہوتا ہے، کبھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور اُن کے عملی تواتر سے، کبھی امت کے اجماع سے، کبھی امت کے اجماع سے اخذ کر کے اور کبھی امت کے اجماع سے قرار پا کر اور کبھی قرآن کے ذریعۂ ثبوت کے برابر ذریعۂ ثبوت سے۔

چنانچہ وہ اپنے اس موقف کو بیان کرتے ہوئے پہلے سنت کی تعریف لکھتے ہیں کہ:

1۔ ''سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔''

(میزان، ص 14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی، ص 10، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

قارئین کرام! سنت کی یہ تعریف دین کی کسی معتبر کتاب میں موجود نہیں ہے اور اُمت مسلمہ کے اہلِ علم میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

2۔ پھر آگے چل کر ہم سنت کی وہ تعریف لکھیں گے جو اہلِ علم کے ہاں مسلم ہے۔اس سنت کے ثبوت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار

سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور قرآن ہی کی طرح ہر دور میں امت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔" (میزان، ص 14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی ص 11، طبع دوم، فروری 2005ء، لاہور)

3۔ اسی بات کو وہ دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں کہ:

"قرآن ہی کی طرح سنت کا ماخذ بھی امت کا اجماع ہے اور جس طرح وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور قولی تواتر سے اُمت کو ملا ہے، اسی طرح یہ اُن کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے۔" (میزان، ص 60، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی، ص 67، طبع فروری 2005ء، لاہور)

4۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

"جس طرح قرآن خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتا، اسی طرح سنت بھی اس سے ثابت نہیں ہوتی۔" (میزان، ص 60، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول ومبادی، ص 67، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

5۔ ایک اور جگہ اسی مضمون کو اس طرح لکھتے ہیں کہ:

"ثبوت کے اعتبار سے اس (سنت) میں اور قرآن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ جس طرح اُمت کے اجماع سے ثابت ہے، یہ بھی اسی طرح اُمت کے اجماع ہی سے اخذ کی جاتی ہے۔" (میزان، ص 62، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی، ص 70، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک:

① سنت خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتی۔

② ثبوت کے اعتبار سے سنت اور قرآن میں کوئی فرق نہیں۔

③ سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی ہے اور یہ ہر دور میں اُمت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔

اب ہم ان نکات کا علمی جائزہ لیں گے۔

ا۔ کیا سنت خبر واحد سے ثابت نہیں ہوتی؟

غامدی صاحب کا دعوٰی ہے کہ سنت خبرِ واحد (اخبار آحاد) سے ثابت نہیں ہوتی اس کے ثبوت کے لیے اجماع اور تواتر شرط ہے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ سنت خبر واحد سے ثابت ہوتی ہے اور اس کے لیے اجماع اور تواتر کی شرط بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ آج تک امت کے معتمد اور ثقہ اہل علم میں سے کسی نے سنت کے ثبوت کے لیے تواتر کی شرط عائد نہیں کی۔ ہم کہتے ہیں سنت کیا پورا دین خبر واحد سے ثابت ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین کی حدیث جبریل علیہ السلام خبر واحد ہے اور اس میں پورا دین بیان کیا گیا ہے جس کی تصدیق خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے کہ وہ جبریل علیہ السلام تھے جو تمہیں دین سکھانے کے لیے آئے تھے۔

یہ حدیث جبریل علیہ السلام صحیح بخاری میں اس طرح روایت ہوئی ہے کہ:

((عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ بَارِزًا يَوْمًا لِلنَّاسِ فَأَتَاهُ جِبْرِيلُ فَقَالَ: مَا الْإِيمَانُ؟ قَالَ الْإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَبِلِقَائِهِ وَرُسُلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ. قَالَ: مَا الْإِسْلَامُ؟ قَالَ: الْإِسْلَامُ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤَدِّيَ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ. قَالَ: مَا الْإِحْسَانُ؟ قَالَ: أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ. قَالَ: مَتَى السَّاعَةُ؟ قَالَ: مَا الْمَسْئُولُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَسَأُخْبِرُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا: إِذَا وَلَدَتِ الْأَمَةُ رَبَّهَا وَإِذَا تَطَاوَلَ رُعَاةُ الْإِبِلِ الْبُهْمُ فِي الْبُنْيَانِ، فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ ﷺ ﴿إِنَّ

اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ الْآيَةَ ثُمَّ أَدْبَرَ. فَقَالَ: رُدُّوهُ، فَلَمْ يَرَوْا شَيْئًا. فَقَالَ: هٰذَا جِبْرِيلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ.))

(صحیح بخاری: حدیث 50)

''سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: ایک دن نبی کریم ﷺ لوگوں کے سامنے تشریف فرما تھے کہ آپ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، فرشتوں پر، قیامت کے دن اللہ کے حضور پیش ہونے پر، اللہ کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کا یقین رکھو۔ اُس نے مزید سوال کیا: یارسول اللہ! اسلام کیا ہے؟ فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو۔ پھر اُس نے عرض کیا: یارسول اللہ! احسان کیا ہے؟ فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اُس نے سوال کیا: یارسول اللہ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: جس سے سوال کیا گیا ہے وہ بھی سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔ البتہ میں تم کو قیامت کی کچھ نشانیاں بتاتا ہوں۔ جب لونڈی اپنا آقا جنے گی اور جب اونٹوں کے سیاہ فام چرواہے بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے پر بازی لے جائیں گے۔ قیامت کا علم ان پانچ غیب کی باتوں میں سے ہے جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ ﷺ نے آیت تلاوت فرمائی: ''قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے، وہی بارش برساتا ہے، وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا اور نہ کسی کو یہ خبر ہے کہ کس جگہ اس کو موت آنی ہے۔'' (لقمان:34) پھر وہ شخص پیٹھ پھیر کر چلا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے واپس بلاؤ۔'' مگر وہ نہ ملا۔

آپ ﷺ نے فرمایا "یہ جبرائیل علیہ السلام تھے جو لوگوں کو اُن کا دین سکھانے آئے تھے۔" (صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث صحیح مسلم: 97 میں بھی موجود ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ پورا دین تو خبر واحد (اخبار آحاد) سے ثابت ہو سکتا ہے مگر اس سے غامدی صاحب کی کوئی سنت ثابت نہیں ہو سکتی۔

پھر اسی خبر واحد (اخبار آحاد) سے ہمیں وہ کلمہ طیبہ نصیب ہوتا ہے جس کے پڑھنے کے بعد ہم مسلمان کہلاتے ہیں اور جسے چھوڑ دینے سے ہم غیر مسلم قرار پاتے ہیں۔

اس کے علاوہ تمام علمائے اسلام کے نزدیک سینکڑوں سنن (سنتیں) اور اُن کے احکام ایسے ہیں جو خبر واحد (اخبار آحاد) سے ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند ایک یہ ہیں:

1۔ وضو میں موزوں پر مسح کرنا (مسح علی الخفین)۔
2۔ شہید کی میت کو نہ تو غسل دینا اور نہ اُسے کفن پہنانا۔
3۔ اذان کا طریقہ۔
4۔ نماز کی حالت میں قہقہے سے نماز اور وضو دونوں کا ٹوٹ جانا۔
5۔ عورت پر جمعہ کی نماز کا فرض نہ ہونا۔
6۔ مسلمان کی میت پر نماز جنازہ پڑھنا۔
7۔ ماں کی عدم موجودگی میں میت کی دادی کو وراثت میں سے چھٹا حصہ $\frac{1}{6}$ دینا۔
8۔ وارث کے حق میں وصیت کا ناجائز ہونا۔
9۔ مرتد کے لیے قتل کی سزا (حد) ہونا۔
10۔ شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی سزا (حد) ہونا۔
11۔ مفتوح پارسیوں (مجوسیوں) سے جزیہ لینا۔
12۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد قریش کی حکمرانی کا حق ہونا۔
13۔ نبی کریم ﷺ کی جس جگہ وفات ہوئی آپ ﷺ کا وہیں مدفون ہونا۔
14۔ مردوں کے لیے ریشم اور سونے کا استعمال ممنوع ہونا۔

15۔ مدینہ منورہ کا حرم ہونا۔

16۔ قرآن مجید کی تلاوت کے وقت مقاماتِ سجود پر سجدہ کرنا۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار شرعی احکام اور سنن ہیں جو خبر واحد سے ثابت ہیں۔

2۔ کیا قرآن اور سنت کے ثبوت میں کوئی فرق نہیں؟

غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے قرآن اور سنت میں کوئی فرق نہیں؟

ہم کہتے ہیں کہ دونوں کے ثبوت میں فرق ہے اور اس کے دلائل یہ ہیں:

1۔ قرآن مجید امت کے تواتر سے ثابت ہے جب کہ سنت کے لیے صحیح حدیث کا ہونا کافی ہے اور صحیح حدیث ایک یا دو ثقہ اور عادل راویوں سے بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر:

موطا امام مالک رحمہ اللہ میں ہے کہ ایک شخص کی وفات کے بعد اُس کی دادی سیّدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں اپنی میراث طلب کرنے کے لیے آئی تو آپ نے فرمایا:

((مَـالَكِ فِـيْ كِتَـابِ اللّٰهِ شَيْءٌ، وَمَا عَلِمْتُ لَكِ فِيْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ شيئًا، فَارْجِعِيْ حَتّٰى أَسَالَ النَّاسَ .)) (مؤطاامام مالک)

"تیرے لیے اللہ کی کتاب میں کوئی حق موجود نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں تیرا کوئی حق مجھے معلوم نہیں ہے۔ لہٰذا تم ابھی واپس چلی جاؤ تا کہ میں دوسرے لوگوں سے دریافت کرلوں۔"

اس کے بعد سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے دریافت فرمایا تو سیّدنا مغیرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ اُن کی موجودگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میّت کی دادی کو چھٹا حصہ $\frac{1}{6}$ دلایا تھا۔ اس پر سیّدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اُن سے پوچھا کیا اُس وقت تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تھا۔ اس کے بعد جب سیّدنا محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ عنہ نے بھی اس حدیث کی تائید کردی تو سیّدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس عورت کو میراث کا $\frac{1}{6}$ چھٹا حصہ دلایا۔"

مذکورہ حدیث خبر واحد بھی ہے کہ اس کے صرف دو راوی ہیں لیکن اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی سنت ثابت ہوتی ہے جس پر خلیفہ اوّل سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اسے سنت سمجھ کر اس پر عمل فرمایا اور آج تک اہل علم اس پر متفق ہیں کہ میّت کے ترکے میں سے والدہ کی عدم موجودگی میں دادی کو چھٹا حصہ دیا جائے گا اور یہ سنت ثابتہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا ہے کہ سنت کا ثبوت خبر واحد (اخبار آحاد) سے ہوجاتا ہے اور اس کے لیے اجماع، تواتر کی کوئی شرط نہیں ہے۔ البتہ قرآن کا ثبوت خبر واحد (اخبار آحاد) سے نہیں ہوتا اس کے لیے امت کا تواتر ضروری ہے۔

3۔ سنت کے بارے میں غامدی صاحب کی فکری تضاد بیانی:

سنت کے ثبوت کے حوالے سے غامدی صاحب کی مذکورہ ابتدائی چاروں تحریروں میں اُن کی ذہنی قلابازیاں اور فکری تضاد بیانیاں ملاحظہ ہوں کہ وہ کبھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:

1۔ سنت کا ثبوت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع سے ہوتا ہے۔

پھر دوسرے لمحے یہ کہنا شروع کردیتے ہیں:

2۔ سنت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجماع اور اُن کے عملی تواتر سے ثابت ہوتی ہے۔

پھر تیسرے لمحے یہ فرمانے لگتے ہیں کہ:

3۔ سنت امت کے اجماع سے ثابت ہوتی ہے۔

اور چوتھے لمحے یہ ارشاد ہوتا ہے کہ:

4۔ سنت امت کے اجماع سے اخذ کی جاتی ہے۔

اب ان چاروں میں سے اُن کے کس موقف کو صحیح سمجھا جائے؟ جبکہ اجماع اور چیز ہے اور جسے تواتر کہا جاتا ہے وہ دوسری چیز ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے جسے غامدی صاحب ایک چیز قرار دے رہے ہیں۔ اگر سنت کے ثبوت کے لیے تواتر کی شرط عائد کردی جائے تو پھر امت کو دین اسلام کے نوے (90) فی صد احکام و تعلیمات سے محروم ہونا پڑتا ہے کیونکہ وہ صرف اور صرف خبر واحد (اخبار آحاد) سے ثابت ہیں۔ اب نوے 90 فی صد دین چھوڑ کر اُس کے صرف 10 فی صد کو لے کر غامدی صاحب کا گزارہ تو ہوسکتا ہے مگر امت

مسلمہ اپنے دین کے نوے (90) فی صد حصے سے نہ تو دست بردار ہو سکتی ہے اور نہ اُس کے صرف دس فی صد حصے پر قناعت کر سکتی ہے۔

4۔ دینی اصطلاحات کے ساتھ مذاق کا رویہ:

غامدی صاحب اپنی لفاظی کے ذریعے دوسروں کو مغالطہ اور فریب دینے کے عادی ہیں ہم اُن کے اس طریقِ واردات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ وہ معروف دینی اصطلاحیں تو امت سے لیتے ہیں مگر ان کے مطالب و مفاہیم اپنے جی سے گھڑتے ہیں اس طرح وہ خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔

زیر بحث موضوع کے حوالے سے بھی انہوں نے اپنی مذکورہ عبارات کے ذریعے دینی اصطلاحات کے بارے میں دوسروں کو کئی مغالطے اور فریب دینے کی سعی فرمائی ہے۔

اُنہوں نے سنت، حدیث، اجماع اور تواتر جیسی دینی اصطلاحات کے مفاہیم بدل کر خلط مبحث پیدا کر دیا ہے۔ سنت کی اصطلاح ہی کو لیجیے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ سنت سے مراد نبی کریم ﷺ کے اقوال، افعال، تقریرات (خاموش تائیدات) اور صفات ہیں۔

"اَمَّا السُّنَّةُ: فَهِيَ اَقْوَالُ النَّبِيِّ ﷺ وَاَفْعَالُهُ وَتَقْرِيْرَاتُهُ وَصِفَاتُهُ."

(اصول الفقہ الاسلامی از الدکتور وہبہ زُحیلی، ج1، ص449 طبع دمشق)

لیکن غامدی صاحب سنت کی من مانی تعریف کرتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ:

"سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔"

(میزان، ص14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی، ص10، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

اسی طرح وہ حدیث کی معروف دینی اصطلاح کو محض اخبارِ آحاد میں محدود کر کے اُس کو دین سے خارج کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

”نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں ان کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ان سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔“

(میزان، ص طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول و مبادی ص 68، طبع دوم فروری 2005ء لاہور)

اسی طرح وہ ایک اور مقام پر حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

”رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار آحاد جنھیں بالعموم حدیث کہا جاتا ہے ان کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کبھی درجہ یقین کو نہیں پہنچتا، اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔“

(میزان ص 15، طبع سوم مئی 2008، لاہور)

(اصول و مبادی، ص 11، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

سوال یہ ہے کہ غامدی صاحب کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ امت کی معروف شرعی اصطلاحات کے معنی اپنے جی سے گھڑ کر خلقِ خدا کو گمراہ کریں۔

دینی اصطلاحات کے معنی بدلنے کے بارے میں خود غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر ”تدبر قرآن“ کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

”منکرین حدیث کی یہ جسارت کہ وہ صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ اور عمرہ و قربانی کا مفہوم بھی اپنے جی سے بیان کرتے ہیں اور اُمت کے تواتر نے ان کی جو شکل ہم تک منتقل کی ہے اس میں اپنی ہوائے نفس کے مطابق ترمیم و تغیر کرنا چاہتے ہیں، صریحاً خود قرآن مجید کے انکار کے مترادف ہے اس لیے کہ جس تواتر نے ہم تک قرآن کو منتقل کیا ہے اسی تواتر نے ان اصطلاحات کی عملی صورتوں کو بھی ہم تک منتقل کیا ہے۔ اگر وہ ان کو نہیں مانتے تو پھر خود قرآن کو ماننے کے لیے

بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔"

(تدبر قرآن جلد اوّل، ص 29، مطبوعہ 1983ء، لاہور)

اب غامدی صاحب ذرا اپنے اُستاد صاحب کے اس آئینے میں دیکھ کر بتائیں کہ کیا وہ وہی حرکت نہیں کر رہے جو منکرین حدیث کیا کرتے ہیں؟ اگر اُن کے استاد و امام صاحب کے فتویٰ کے مطابق منکرین حدیث اس قصور پر کہ وہ قرآنی اصطلاحات کے مفہوم میں ترمیم و تغیر کرتے ہیں، منکرین قرآن ٹھہرتے ہیں تو کیا غامدی صاحب سنت اور حدیث کی اصطلاحات کے مفہوم میں تغیر وتبدل کرنے کے بعد منکر سنت اور منکر حدیث نہیں ٹھہرتے؟

ہم کہتے ہیں کہ امت کی معروف دینی اور شرعی اصطلاحات کے مفاہیم و مطالب کو بدلنا حماقت بھی ہے اور شرارت بھی، مغالطہ انگیزی بھی ہے فتنہ انگیزی بھی، فریب دہی بھی ہے خیانت کاری بھی، ڈھٹائی بھی ہے اور بے شرمی بھی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ تاریخ اسلام میں سیّدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور سیّدنا عمر رضی اللہ عنہ کے لیے شیخین کی اصطلاح موجود ہے اور علم حدیث میں امام بخاری اور امام مسلم کو شیخین کہا جاتا ہے (جبکہ فقہ حنفی میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کو شیخین کہا جاتا ہے) اب اگر کوئی شخص تاریخ اسلام کے شیخین کو علم حدیث کے شیخین قرار دے لے اور علم حدیث کے شیخین کو تاریخ اسلام کے شیخین ٹھہرائے تو ایسے آدمی کا کیا علاج؟ کیا پھر اُسے ٹی وی پر لوگوں کو دین سکھانے کے دھندے پر لگایا جائے یا کسی شفا خانہ امراضِ دماغی میں داخل کرایا جائے؟ اور پھر جب وہ اس کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کر دے کہ سیّدنا ابوبکر صدیق اور سیّدنا عمر رضی اللہ عنہما نے صحیحین مرتب کی تھی اور امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ مسلمانوں کے بالترتیب پہلے اور دوسرے خلیفہ ہو گزرے ہیں تو خدارا بتایئے اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اور ایسے شخص کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ ع

بسوخت عقل زِ حیرت ایں چہ بوالعجبی ست



باب نمبر 4:

کیا احادیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کا اہتمام نہیں کیا گیا؟

دوسرے منکرین حدیث کی طرح غامدی صاحب کا بھی دعویٰ ہے کہ حدیث کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ دین کا حصہ نہیں۔ یہ دین سے الگ کوئی غیر اہم شے ہے۔ دین کا کوئی عقیدہ اور عمل اس سے ثابت نہیں ہوتا۔ اگر احادیث کی کچھ اہمیت ہے اور یہ بھی دین کا حصہ ہیں تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کا خود کوئی اہتمام کیوں نہ فرمایا۔ چنانچہ وہ اپنی مشہور ''ڈنڈی مار'' کتاب ''میزان'' میں 'مبادئ تدبر حدیث' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

''نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے۔ ان کے بارے میں یہ دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحب علم انہیں ماننے سے انکار نہیں کرسکتا۔ ایک یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔ (ایک خطبہ حجۃ الوداع کے متعلق البتہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے دوسروں تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی تھی، لیکن اس کے بھی چند جملے ہی روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں اس نوعیت کی کوئی چیز تاریخ کے کسی مستند ماخذ میں مذکور نہیں۔) دوسری یہ کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی علم یقین کے

درجے تک نہیں پہنچتا۔ حدیث سے متعلق یہی دو حقائق ہیں جن کی بنا پر یہ ماننا تو ناگزیر ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔"

(میزان: ص 68، طبع دوم اپریل 2002ء، لاہور)

ذیل میں ہم سب سے پہلے غامدی صاحب کی اس پُر فریب اور مغالطہ انگیز تحریر کا تجزیہ کریں گے اور پھر اس پر جامع تبصرہ کیا جائے گا۔ ❶

1۔ مغالطہ انگیزی اور فریب دہی:

1۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ حدیث کے اصطلاحی مفہوم میں خبر متواتر (اخبارِ متواترہ) بھی شامل ہوتی ہے، لیکن مذکورہ عبارت کے ذریعے غامدی صاحب نے اخبارِ متواترہ کو حدیث کے اصطلاحی مفہوم سے نکالنے اور اسے محض اخبارِ آحاد کے مفہوم میں محدود کردینے کے لیے لکھ دیا ہے کہ اس سے صرف وہی روایتیں مراد ہیں:

"جو زیادہ تر اخبارِ آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں۔"

اس طرح غامدی صاحب نے اپنے قارئین کو دھوکا اور فریب دینے کے لیے اصطلاح تو محدثین سے لی ہے مگر اُسے اپنے ذاتی معنی پہنا کر پیش کردیا ہے۔

غامدی صاحب اس بات کے عادی ہیں کہ وہ معروف دینی اور شرعی اصطلاحیں تو علمائے اسلام سے لیتے ہیں مگر ان اصطلاحوں کے مفاہیم بدل کر انہیں اپنے من پسند معنی پہناتے ہیں۔ یہی حرکت انہوں نے سنت کی دینی اصطلاح کے بارے میں بھی کی ہے اور وہ اس کے اصطلاحی مفہوم کو چھوڑ کر اپنا یہ اختراعی مفہوم مراد لیتے ہیں کہ

"سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔" (میزان: ص 14، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

---

❶ "میزان" کے نئے ایڈیشن طبع سوم مئی 2008ء میں "دو باتیں...... سے لے کر...... ناگزیر ہے کہ اس"...... تک کی پوری عبارت حذف کردی گئی ہے تاکہ ممکنہ تنقید سے بچا جاسکے۔ (مصنف)

اسی طرح دیگر دینی اصطلاحات کے ساتھ بھی وہ یہی سلوک کرتے ہیں۔ ایک طرف وہ شرعی اصطلاحوں کے اصلی مفاہیم سے انکاری ہیں مگر انہی اصطلاحات کے استعمال پر مُصر بھی ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ ؎

منکرِ مَے بودن و ہم رنگِ مستان زیستن

2۔ غامدی صاحب نے مذکورہ عبارت کے ذریعے اپنے قارئین کو دوسرا یہ دھوکا اور مغالطہ دینے کی سعی فرمائی ہے کہ اُنہوں نے شروع ہی میں یہ کہہ دیا ہے کہ وہ آگے چل کر جن جن باتوں کا دعویٰ کریں گے اور جو کچھ اپنے جی سے بیان کریں گے، وہ از خود اتنی واضح اور مبنی بر حقیقت ہوں گی کہ کوئی صاحب علم نہ تو اُن سے اختلاف کرسکتا ہے اور نہ اُن کو ماننے سے انکار کی جرأت کرسکتا ہے؟ جبکہ اُن کے کسی دعویٰ کو تسلیم کرنا کسی صاحب علم پر لازم نہیں اور وہ غامدی صاحب کی کسی بھی بات سے اختلاف کا حق رکھتا ہے، کیونکہ شریعت اسلامیہ میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے سوا ہر شخص سے اختلاف کی گنجائش ہے اور اس حوالے سے قرآن وسنت کی نصوص کی تصریحات موجود ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا غامدی صاحب معصوم عن الخطا ہیں کہ اُن کی کسی بات میں غلطی کا کوئی امکان نہیں؟ یا وہ وحی کی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں کہ ان سے دوسرے اہل علم کو اختلاف کی مجال نہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ کس برتے پر اپنے خیالات اور دعاوی کے بارے میں کہتے ہیں کہ

> ''یہ دو باتیں ایسی واضح ہیں کہ کوئی صاحب علم اُنہیں ماننے سے انکار نہیں کرسکتا۔''

گویا ہر صاحب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ غامدی صاحب کے رطب ویابس پر آمنا وصدقنا کہے، ورنہ اُسے صاحب علم ہونے کے اعزاز سے محروم ہونا پڑے گا۔

3۔ مذکورہ تحریر کے ذریعے غامدی صاحب یہ مغالطہ اور دھوکا بھی دینا چاہتے ہیں کہ پہلے تو

وہ جوش میں آ کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ

''رسول اللہ ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔''

لیکن پھر اُن کو جلد یہ خیال آتا ہے کہ اتنا بڑا جھوٹ تو کسی عام پڑھے لکھے آدمی کو بھی ہضم نہیں ہوگا، اس لیے انہوں نے اس عبارت کے نیچے فٹ نوٹ میں دبے لفظوں کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ:

''ایک خطبہ حجتہ الوداع کے متعلق البتہ کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے (حدیث کو) دوسروں تک پہنچانے کی ہدایت فرمائی تھی۔''

پھر چونکہ اس حوالے سے اُن کے اپنے مذکورہ بیان کی تردید کا پہلو نکلتا تھا، اس لیے پھر پینترا بدل کر آگے عبارت میں یہ اضافہ کر دیا کہ

''لیکن اس کے بھی چند جملے ہی روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔''

غامدی صاحب نے ان الفاظ کا اضافہ کر کے نبی کریم ﷺ کے اس عظیم الشان خطبہ حجتہ الوداع کی تعلیمات اور احکام کی اہمیت گھٹانے کی سعیٔ نامراد فرمائی ہے۔ وہ خطبہ جو حضور ﷺ نے لاکھوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجمع کے سامنے دیا اور جو انسانی حقوق کا سب سے بڑا منشور ہے اور جو دین اسلام کا مکمل پیغام ہے۔ غامدی صاحب اُسے یہ کہہ کر ٹھکرا رہے ہیں کہ:

''لیکن اس کے بھی چند جملے ہی روایتوں میں نقل ہوئے ہیں۔''

آخر کیا رسول اللہ ﷺ کے ارشادات اور فرامین و احکام کی یہی حیثیت ہے کہ ان کو مذکورہ گستاخانہ الفاظ میں بیان کیا جائے؟

4۔ مذکورہ حوالے کے ذریعے غامدی صاحب نے دوسروں کو چوتھا یہ مغالطہ اور فریب دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ آگے اسی فٹ نوٹ میں فرماتے ہیں کہ

''اس کے علاوہ کسی چیز کے بارے میں اس نوعیت کی کوئی چیز تاریخ کے کسی مستند

ماخذ میں مذکور نہیں۔"

ان الفاظ سے غامدی صاحب دوسروں کو یہ باور کراتے ہیں کہ وہ کسی بھی بات کو ماننے کے لیے تیار ہیں جو تاریخ کے کسی مستند ماخذ میں مذکور ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جو شخص بخاری اور مسلم کی متفق علیہ اور صحیح احادیث کو کچھ اہمیت نہ دیتا ہو اور اُن کو ماننے کے لیے ہرگز آمادہ نہ ہو، وہ تاریخ کے کسی مستند ماخذ کو کیسے مان کر دے گا؟ جس آدمی کا نظریہ یہ ہو کہ:

"کسی چیز کو بھی خواہ وہ حدیث کی اُمہات کتب بخاری و مسلم اور موطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ہی میں کیوں نہ بیان ہوئی ہو، آپ کی نسبت سے ہرگز کوئی اہمیت نہ دی جائے۔" (ملاحظہ ہو غامدی صاحب کی کتاب 'میزان': ص 62، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

تو کیا جو آدمی بخاری اور مسلم کی صحیح روایات کو نہیں مانتا، وہ ابن خلدون اور طبری کی کتب تاریخ کو مان لے گا؟ جو شخص اجماعِ قطعی سے ثابت شدہ شرعی احکام کو تسلیم نہیں کرتا، وہ طبقاتِ ابن سعد اور تاریخ مسعودی کو کیسے تسلیم کرلے گا؟

قارئین کرام! میں اصل موضوع پر بحث کرنے سے پہلے تمہید کے طور پر غامدی صاحب کے اندازِ بیان کے دجل و فریب کا پردہ چاک کر رہا ہوں تو اس سے میرا مقصود صرف یہ ہے کہ میں آپ کو اس شخص کے طریق واردات سے آگاہ کردوں جو "زخرف القول غروراً" کے مصداق اپنے مخاطب کو فریب دینے کا عادی ہے۔

2۔ نبی کریم ﷺ اور حفاظت حدیث:

اب ہم اصل بحث کی طرف آتے ہیں۔ غامدی صاحب کا دعویٰ ہے کہ:

"رسول اللہ ﷺ نے ان (احادیث) کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔"

ہمارا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو احادیث سننے، ان کو حفظ کرنے اور ان کی کتابت و تحریر کرنے کی تاکید فرمائی اور ایسا کرنے والوں کے حق میں دعا

فرمائی۔ اس طرح آپ ﷺ نے حفظ اور کتابت دونوں ذرائع سے کام لیتے ہوئے احادیث کی حفاظت اور ان کی تبلیغ و اشاعت کا اہتمام فرمایا۔

پھر چونکہ احادیث کا زیادہ حصہ عمل سے متعلق تھا۔ اس لیے ﴿اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرو۔'' کے قرآنی حکم کے مطابق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جیسے حضور ﷺ کو کوئی کام کرتے دیکھا، اُسے ویسے ہی کرنا شروع کر دیا اور یہ سلسلہ نسل در نسل آگے چلتا گیا۔ اس طرح فعلی احادیث کا کثیر ذخیرہ عملی طور پر اُمت کو منتقل ہو گیا جو آج تک اُمت مسلمہ میں جاری و ساری ہے۔ حدیث کی حفاظت اور اس کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کے چند ارشادات درج ذیل ہیں:

1۔ سنن ابوداؤد (کتاب العلم) میں سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ:

((سمعت رسول الله ﷺ يقول: نَضَّر الله امرءً سمع منا حديثاً فحفظه حتى يبلغه......)) (سنن ابوداؤد:3660)

''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''اللہ اُس شخص کو ترو تازہ رکھے جو ہم سے حدیث سنے، پھر اُسے یاد اور محفوظ رکھے اور پھر اُسے دوسروں تک پہنچا دے......''

گویا اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ایسے ہر شخص کے حق میں دعا فرمائی ہے جو آپ سے حدیث سن کر اُسے یاد رکھے اور پھر دوسرے لوگوں تک پہنچائے۔

2۔ اُسی طرح جامع ترمذی میں بھی سیدنا زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ

((نَضَّر اللّٰه امرأ سَمِعَ منا حديثًا فحفظه حتى يبلغه غيره......))

(جامع ترمذی:2656)

''اللہ اُس آدمی کو ترو تازہ اور شاداب رکھے جس نے ہم سے کوئی حدیث سن کر

یاد کر لی اور اُسے دوسرے تک پہنچا دیا......"

3۔ جامع ترمذی ہی میں ایک اور حدیث سیّدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ

((نضر الله امرأ سمع منا شيئًا فبلّغه كما سمعه، فرُبَّ مبلغ أوعى من سامع .)) (ترمذی:2657)

"اللہ تعالیٰ اُس شخص کو تر وتازہ رکھے جس نے مجھ سے کچھ سنا۔ پھر جیسے اُس نے سنا تھا ویسے ہی دوسروں تک اسے پہنچا دیا۔ ممکن ہے جسے بات پہنچائی جائے وہ پہلے سننے والے سے بھی زیادہ اُسے یاد رکھنے والا ہو۔"

4۔ جامع ترمذی میں ایک اور روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((نضر الله امرء سمع مقالتي فوعاها وحفظها وبلغها......))

(رقم:2658)

"اللہ تعالیٰ اُس شخص کو تر وتازہ رکھے جس نے میری کوئی بات سنی، پھر اُسے یاد رکھ کر محفوظ کر لیا اور اُسے کسی اور تک پہنچا دیا۔"

اس کے علاوہ اسی مضمون کی احادیث سیّدنا معاذ بن جبل، سیّدنا جبیر بن مطعم اور سیّدنا ابو درداء رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

5۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں سیّدنا ابو شریح عدوی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے دوسرے روز ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ

((وليبلغ الشاهد الغائب .)) (صحیح بخاری:104، صحیح مسلم:3304)

"اور ضروری ہے کہ جو یہاں حاضر ہے، وہ اُس تک (میری باتیں) پہنچا دے جو یہاں حاضر نہیں ہے۔"

6۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((فلیبلغ الشاھد الغائب .)) (صحیح بخاری:1741)

''پس لازم ہے کہ جو یہاں پر حاضر ہے، وہ اُس تک جو یہاں حاضر نہیں ہے، (میری باتیں) پہنچادے۔''

نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ ارشادات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو احادیث کی حفاظت اور ان کی تبلیغ و اشاعت کی تاکید فرمائی اور ایسا کرنے والوں کے حق میں بار بار دُعا بھی فرمائی۔

3۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور حفاظتِ حدیث:

نبی کریم ﷺ کے مذکورہ بالا ارشادات کی روشنی میں اور ان کے احکام کی تعمیل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ یاد کرلیا، اُسے لکھ کر محفوظ کیا، اس پر خود عمل کیا اور اسے دوسروں لوگوں تک پہنچادیا۔

ذیل میں ہم چند مکثرین (بکثرت روایت کرنے والے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بیان کریں گے کہ اُنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے ہزاروں احادیث سن کر یاد کرلیں اور پھر ان کو دوسروں تک پہنچایا:

① سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے 5374 حدیثیں حفظ کر کے اُمت تک منتقل کیں۔

② سیّدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے 2630 حدیثیں یاد کیں اور پھر ان کو امت تک پہنچایا۔

③ سیّدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے 2286 حدیثیں زبانی یاد کر کے محفوظ کیں اور پھر ان کو امت کے حوالے کیا۔

④ اُمّ المؤمنین سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے 2210 حدیثیں یاد کرنے کے بعد دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔

⑤ سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے 1660 حدیثیں حفظ کرنے کے بعد اپنے شاگردوں تک منتقل کیں۔

⑥ سیّدنا جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ نے 1540 حدیثیں یاد کیں اور دوسروں تک

پہنچائیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے احادیث کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا۔

⑦ سیّدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما نے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے 848 حدیثیں حفظ کیں اور ان کو دوسرے لوگوں تک پہنچایا۔

جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حدیثیں لکھیں اور ان کے مجموعے (صحیفے) مرتب کیے یا املا کرائے اُن کی تعداد پچاس کے قریب ہے، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ سیّدنا جابر بن عبد اللہ انصاری رضی اللہ عنہ کا صحیفہ جسے 'صحیفہ ابوزبیر' بھی کہا جاتا ہے۔
2۔ صحیفہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ
3۔ صحیفہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ
4۔ صحیفہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما
5۔ صحیفہ جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ
6۔ صحیفہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ
7۔ صحیفہ سیّدنا سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ
8۔ صحیفہ سہل بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ
9۔ صحیفہ براء بن عازب رضی اللہ عنہ
10۔ صحیفہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، جو صحیفہ ہمام بن منبہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ ساری تفصیل جان لینے کے بعد بھی کیا کوئی معقول شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ "رسول اللہ ﷺ نے ان (احادیث) کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کیا۔"

کیا اخبارِ آحاد دین کا حصہ نہیں؟

غامدی صاحب پہلے تو یہ دعویٰ فرماتے ہیں کہ

"اس (حدیث) سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی علم یقین کے درجے کو نہیں پہنچتا۔"

اور پھر اس دعویٰ کی بنا پر خود ہی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

”اس کی بنا پر یہ ماننا تو ناگزیر ہے کہ اس سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا اضافہ نہیں ہوتا۔“

اب ہم پہلے ان کے دعوے پر گفتگو کریں گے اور آخر میں ان کے نکالے ہوئے نتیجے پر تبصرہ کریں گے۔

کیا حدیث سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا؟

حقیقت یہ ہے کہ اس بات پر تمام محدثین اور فقہائے اسلام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ خبر متواتر، جو حدیث ہی کی ایک قسم ہے، اس سے علم یقین حاصل ہوتا ہے۔

غامدی صاحب جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث سے علم یقین حاصل نہیں ہوتا تو وہ ایک ایسی بات کرتے ہیں جس کا اہل علم میں سے کوئی بھی قائل نہیں اور اجماع امت کے مقابلے میں تنہا غامدی صاحب کی رائے کیا حیثیت رکھتی ہے؟

پھر اس بات پر تمام محدثین عظام اور فقہائے کرام کا اجماع اور اتفاق ہے کہ اخبارِ آحاد کا درجہ اگرچہ اخبار متواترہ سے کچھ کم ہے، تاہم جب وہ صحیح ہوں تو وہ بھی دین میں حجت اور دلیل ہوتی ہیں اور ان سے بھی ہر طرح کے شرعی احکام اخذ ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر کوئی مسلمان اپنے وارث کے حق میں مالی وصیت نہیں کرسکتا اور نہ وہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کرسکتا ہے۔ یہ دونوں مسلمہ اجماعی شرعی احکام ہیں مگر یہ صرف اور صرف اخبارِ آحاد سے ثابت ہیں۔ اگر اخبارِ آحاد کو دین سے نکال دیا جائے تو پھر دین اسلام کے 90 فیصد حصے کو بھی دین سے خارج کرنا پڑے گا اور مسلمہ اسلامی احکام و تعلیمات کو چھوڑنا پڑے گا۔

اور ہم یہ بات پورے حزم واحتیاط سے بیان کر رہے ہیں، ورنہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اخبارِ آحاد ترک کرنے سے ہمیں پورا دین ترک کرنا پڑے گا اور اپنے ایمان سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے، کیونکہ ہمارا کلمہ اسلام (کلمہ طیبہ اور شہادتین) لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ صرف اور صرف اخبارِ آحاد ہی سے ثابت ہے، ان کے سوا اس کلمے کا اثبات

کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ یہ کلمہ نہ تو قرآن سے ثابت ہے اور نہ غامدی صاحب کی بتائی ہوئی سنت کی فہرست میں شامل ہے۔ جب کہ حال یہ ہے کہ اس کلمے کے اقرار ہی سے کوئی شخص دین کے دائرے میں داخل ہوتا اور اس کے انکار سے وہ دین کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ یہی کلمہ اسلام اور کفر میں امتیاز اور حدِ فاصل ہے۔ اسی کو پڑھنے سے آدمی مسلمان ہوتا اور اسے چھوڑنے سے وہ کافر اور مرتد ہو جاتا ہے۔ یہ کلمہ ہمارے دین کی اساس ہے مگر اس کی بنا بھی صرف اخبارِ آحاد پر قائم ہے۔

خود قرآنِ مجید ہمیں اخبارِ آحاد کی بنیاد پر شرعی فیصلے کرنے کا مجاز قرار دیتا ہے۔ وہ ہمیں ایک، دو یا چار معتبر اور عادل ﴿ذَوَا عَدْلٍ﴾ مسلمانوں کی خبر پر یقین کرنے کا پابند کرتا ہے اور ان کی گواہی پر حدود جاری کرنے کا حکم دیتا ہے جس کے نتیجے میں شرعی طور پر کسی مجرم کا ہاتھ کاٹا جاسکتا ہے۔ کسی کو پھانسی پر چڑھا کر قتل کیا جاسکتا اور کسی کی پیٹھ پر کوڑے برسائے جاسکتے ہیں۔ پھر جب قرآنِ مجید نے اپنے نظامِ عدل و انصاف کی بنیاد غیر متواتر شہادتوں اور اخبارِ آحاد پر رکھی ہے تو قرآن کے مقابلے میں کوئی مسلمان یہ کہنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہے کہ کسی حدیث کو حدیث رسول ﷺ یا حکم رسول ﷺ ماننے کے لیے تواتر کی شرط ضروری ہے اور یہ کہ ایک، دو یا چار معتبر اور عادل راویوں کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ ان سے اُسے علمِ یقین حاصل نہیں ہو پاتا۔ جب کہ اسلام میں صرف ایک معتبر اور عادل شخص (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) کی شہادت پر رؤیت ہلال ثابت ہو جاتی ہے جس کے بعد شرعی طور پر مسلمانوں کے لیے دوسرے دن روزہ رکھنا (یا نہ رکھنا) لازم ہو جاتا ہے۔

اخبارِ آحاد میں سے ایک متفق علیہ غریب حدیث ہے کہ "انما الأعمال بالنیات......" "اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔" (صحیح بخاری:1) ہر مسلمان اس فرمانِ نبوی ﷺ سے واقف ہے۔ اس حدیث کے صرف ایک ہی راوی سیّدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں، لیکن ساری اُمت اسے صحیح اور درست مانتی ہے اور فقہائے اسلام اس سے مسائل کا استنباط کرتے اور استدلال میں پیش کرتے ہیں۔

افسوس کہ غامدی صاحب ایک طرف تو حدیث کی اخبارِ آحاد کے بارے میں تواتر کی شرط لگاتے ہیں اور اس کے پورا نہ ہونے کی صورت میں صحیح احادیث کو نا قابلِ اعتماد اور غیر یقینی ٹھہرانے لگتے ہیں اور دوسری طرف اگر ان کو کوئی ضعیف بلکہ موضوع اور من گھڑت روایت بھی مل جائے جو اُن کی خواہش اور ہوائے نفسانی کے مطابق ہو تو اُسے وہ بلا تامل مان لیتے اور اسے دلیل کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ درج ذیل حدیث جو بالاتفاق موضوع اور من گھڑت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ تبوک سے واپسی کے موقع پر فرمایا تھا:

((رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر .))

(السلسلة الضعيفة والموضوعة للالبانى: 2460)

''ہم جہادِ اصغر (قتال فی سبیل اللہ) سے جہادِ اکبر (جہاد بالنفس) کی طرف واپس لوٹے ہیں۔''

تو دیکھئے ایسی بے اصل اور موضوع روایت کو غامدی صاحب کس طرح مانتے ہیں، اس سے اُن کو علم یقین بھی حاصل ہو جاتا ہے اور پھر اس سے استدلال بھی فرماتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس امر میں کوئی شک نہیں کہ قرآن اور حدیث دونوں میں جہاد کا لفظ اپنے لغوی مفہوم میں بھی بکثرت استعمال ہوا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مکہ مکرمہ میں دین کی دعوت و تبلیغ کا آغاز کیا تو اُسے بھی جہاد کہا گیا۔ آپ ﷺ نے مدینہ میں سربراہِ ریاست کی حیثیت سے یہود و نصاریٰ اور دوسرے مشرکین عرب کو دین کی دعوت پیش کی تو اسے بھی جہاد کا عنوان دیا۔ ایک غزوہ سے واپسی پر اپنے ساتھیوں کو عام زندگی میں تقویٰ اور راست روی کی روش اختیار کرنے کی نصیحت کی تو اسے قتال فی سبیل اللہ کے مقابلے میں جہادِ اکبر قرار دیا۔ چنانچہ ان معنوں میں دین کی سربلندی کے لیے کئے گئے کسی بھی کام کو جہاد کہا گیا اور اس

میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

(ملاحظہ ہو: ماہنامہ اشراق شمارہ دسمبر 1993، ص 18)

یہ ہے غامدی صاحب کی احادیث کے بارے میں اصول پرستی، تحقیق انیق اور ان پر تدبر کرنے کی اصل حقیقت، جس کا وہ ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں۔



باب نمبر 5:

کیا حدیث دین کا حصہ نہیں ہے؟

حدیث کے بارے میں غامدی صاحب کا تصور یہ ہے کہ اس سے عام طور پر اخبارِ آحاد ہی مراد ہوتی ہیں اور ان سے نہ تو دین کا کوئی عقیدہ، عمل یا حکم ثابت ہوتا ہے اور نہ یہ دین کا حصہ ہیں۔ لیکن ہماری رائے میں اُن کا یہ تصورِ حدیث ہرگز صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں حدیث کی حجیت ختم ہو جاتی ہے جبکہ حدیث و سنت دین میں حجت ہے۔ اس سے نہ صرف اخبارِ آحاد مراد ہوتی ہیں بلکہ اس میں احادیث متواترہ بھی شامل ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ حدیث سے دین کے عقائد، اعمال اور احکامات بھی ثابت ہوتے ہیں۔

چنانچہ وہ حدیث کی اہمیت اور حجیت کا انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبارِ آحاد جنھیں بالعموم حدیث کہا جاتا ہے، اُن کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی درجۂ یقین کو نہیں پہنچتا، اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔"

(میزان ص 15، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(اُصول و مبادی: ص 11، طبع دوم فروری 2005ء، لاہور)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک:

1۔ حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام ہے۔

2۔ حدیث اور دین الگ الگ چیزیں ہیں۔

3۔ کسی حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔

4۔ کسی حدیث سے دین کا کوئی عمل ثابت نہیں ہوتا۔

اب ہم ان تمام اُمور پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

1۔ کیا حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام ہے؟

علم حدیث کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام نہیں ہے بلکہ اس میں اخبارِ متواترہ بھی شامل ہوتی ہیں۔ یہ غامدی صاحب کی روشن خیالی ہے کہ وہ حدیث کو صرف اخبارِ آحاد میں محصور و محدود قرار دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنی ''ربع صدی پر محیط دینی تحقیق کے ساتھ ساتھ کبھی چند لمحے اس پر بھی صرف کرتے کہ علم حدیث کی کوئی متداول کتاب مثلاً ''مقدمۃ ابن الصلاح'' اور ''نخبۃ الفکر'' ہی دیکھ لیتے تو اُن کو یہ معلوم ہو جاتا کہ حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام نہیں ہے بلکہ اس اصطلاح میں اخبارِ متواترہ بھی شامل ہوتی ہیں۔

اُمت کے کسی فقیہ یا محدث نے آج تک حدیث سے صرف اخبارِ آحاد مراد نہیں لیں اور نہ کسی نے اخبارِ متواترہ کو حدیث سے خارج قرار دیا ہے۔ یہ اعزاز صدیوں بعد صرف غامدی صاحب کو حاصل ہوا ہے جنہوں نے تمام محدثین اور فقہا کے برخلاف صرف اخبارِ آحاد کو حدیث سمجھا ہے اور اخبارِ متواترہ کو حدیث کے زمرہ سے نکال باہر کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے کئی بار واضح کیا ہے کہ غامدی صاحب کا طریق واردات یہ ہے کہ وہ اصطلاحات تو علمائے اسلام کی استعمال کرتے ہیں مگر ان کے معانی اپنے جی میں گھڑ لیتے ہیں اور اس طرح خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ وحی، کتاب، سنت، تواتر، فطرت، اِجماع، معروف، منکر اور عرف جیسی بہت سی اسلامی اصطلاحات کے من گھڑت معنی لے کر اُنہوں نے دوسروں کو مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔

چنانچہ غامدی صاحب نے اخبارِ متواترہ کو حدیث کے زمرے سے خارج کر کے ہمارے نزدیک انکارِ حدیث کا ارتکاب کیا ہے۔

2۔ کیا حدیث اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں؟

غامدی صاحب نے حدیث اور دین کو دو الگ الگ چیزیں سمجھ رکھا ہے۔ اُن کے نزدیک

حدیث دین سے خارج کوئی شے ہے، جس سے دین میں کسی عقیدہ وعمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ گویا دین حدیث کے بغیر بھی مکمل ہے اور حدیث دین سے زائد کوئی چیز ہے۔

غامدی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ حدیث کے بغیر دین کا تصور صرف منکرین حدیث کے ہاں پایا جاتا ہے۔ اہل اسلام حدیث وسنت کے بغیر اسلام کو مکمل نہیں سمجھتے، کیونکہ اسلام نام ہی قرآن وحدیث کے مجموعے کا ہے۔ اگر حدیث کو اسلام سے خارج کر دیا جائے تو جو کچھ باقی بچے گا، وہ صحیح اسلام نہیں ہوگا بلکہ ناقص اور اُدھورا اسلام ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ناقص اور ادھورا اسلام مقبول نہیں ہے۔

3۔ کیا حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا؟

غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام کے جو عقائد صرف حدیث سے ثابت ہیں، وہ اُن سب کے منکر ہیں۔

اہل علم جانتے ہیں کہ بہت سے اسلامی عقائد کی بنیاد صرف احادیث پر ہے اور وہ صرف حدیث ہی سے ثابت ہیں جیسے:

1۔ تقدیر پر ایمان: تقدیر پر ایمان لانا حدیث جبریل علیہ السلام سے ثابت ہے اور اس حدیث میں جو اُمور بیان ہوئے ہیں، اُن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین قرار دیا ہے "یعلمکم دینکم" (صحیح مسلم: حدیث 9) لہٰذا تقدیر پر ایمان لانا دین کا حصہ ہے اور اُن امور میں سے ہے جن پر ایمان لائے بغیر کسی مسلمان کا ایمان کامل نہیں ہوتا۔ مگر غامدی صاحب فرما رہے ہیں کہ حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ تقدیر پر ایمان لانا کوئی الگ عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ توحید کے عقیدہ کی فرع ہے تو پھر عقیدۂ آخرت کو عقیدۂ توحید کی فرع قرار دینے میں کون سا امر مانع ہے۔ وہ بھی تو توحید ہی کے عقیدے کی فرع ہے، لیکن اُس کی ایک مستقل حیثیت ہے اسی طرح تقدیر پر ایمان لانے کا عقیدہ بھی اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے حدیث جبریل علیہ السلام میں اس کو الگ اور مستقل حیثیت سے بیان فرمایا ہے اور اس عقیدے کے بغیر کسی مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

عقیدۂ توحید کے علاوہ بہت سے عقائد احادیث ہی کی بنیاد رکھتے ہیں، مثال کے طور پر

2۔ قبر کا عذاب۔ (صحیح بخاری: حدیث 1372)

3۔ قبر میں فرشتوں کا آنا اور میت سے سوال و جواب کرنا۔ (صحیح بخاری:1338)

4۔ یہ عقیدہ کہ تمام اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ (صحیح بخاری:1)

5۔ ختم نبوت کا عقیدہ اور مدعی نبوت کا واجب القتل ہونا۔
(صحیح بخاری:3535، سنن ابی داود:4252)

6۔ یہ عقیدہ کہ گنہگار مؤمن دوزخ کی سزا پانے کے بعد بالآخر جنت میں جائیں گے۔
(صحیح بخاری:7440)

7۔ عیسیٰ علیہ السلام کا آسمان پر زندہ اُٹھایا جانا (رفع عیسیٰ علیہ السلام)، اور ان کا دوبارہ قیامت کے قریب دنیا میں تشریف لانا (نزولِ عیسیٰ علیہ السلام) (صحیح بخاری:2222)

8۔ نیک اعمال کو وسیلہ بنانے کا عقیدہ۔ (صحیح بخاری:2215)

9۔ آخرت میں پل صراط کا ہونا (جَسْــر) جس پر سے سب انسانوں کو گزرنا پڑے گا پھر جو لوگ جنت کے مستحق ہوں گے، وہ اسے عبور کر کے جنت میں داخل ہوں گے اور دوزخی اسے پار نہ کر کے جہنم میں گر جائیں گے۔ (صحیح بخاری:7440)

10۔ (رحمت کے) فرشتے اُس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں تصاویر اور کتے موجود ہوں۔ (صحیح بخاری:3225)

11۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کبریٰ جب آخرت میں وہ سجدہ ریز ہو کر اپنی اُمت کے لیے شفاعت کریں گے اور وہ مقبول شفاعت ہوگی۔ (صحیح بخاری:4712)

12۔ فرشتے نور سے پیدا کیے گئے ہیں۔ (صحیح مسلم:2996)

یہ اور اس طرح کے بہت سے مسلمہ اسلامی عقائد ہیں جو صرف حدیث سے ثابت

ہوتے ہیں۔ اب اگر غامدی صاحب کے اس نظریے کو درست مان لیا جائے کہ حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا تو ہمیں بہت سے مسلمہ اسلامی عقائد کو ترک کرنا پڑے گا اور ہم غامدی صاحب کی خاطر اسلام کے مسلمہ عقائد چھوڑ نہیں سکتے، کیونکہ ایسا کرنا عین گمراہی ہے۔

4۔ کیا حدیث سے دین کا کوئی عمل ثابت نہیں ہوتا؟

غامدی صاحب کے خیال میں حدیث سے دین کا کوئی عمل یا حکم ثابت نہیں ہوتا، لیکن اُن کا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح حدیث سے دین اسلام کے عقائد ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح اس سے دینی اعمال و احکام بھی ثابت ہوتے ہیں۔

پھر جس طرح حدیث سے ثابت شدہ عقائد کا انکار کفر اور گمراہی ہے، اسی طرح حدیث سے ثابت شدہ اعمال و احکام کا انکار بھی کفر اور گمراہی ہے۔ جو شخص بھی حدیث سے ثابت شدہ عقائد و اعمال کا منکر ہے، علمائے اسلام کے نزدیک وہ کافر اور گمراہ ہے۔ ذیل میں ہم چند ایسے دینی اعمال و احکام بیان کرتے ہیں جو صرف حدیث کی بنیاد پر ثابت ہیں:

1۔ مرتد کے لیے سزائے قتل۔ (صحیح بخاری:6878)

2۔ شادی شدہ زانیوں کے لیے رجم یعنی سنگساری کی سزا۔ (صحیح بخاری:6824)

3۔ شراب نوشی پر سزا۔ (صحیح مسلم:1706)

4۔ مردوں کے لیے داڑھی بڑھانا۔ (صحیح بخاری:5893)

5۔ عورتوں کے لیے خاص ایام میں نماز کا معاف ہونا۔ (صحیح بخاری:306)

6۔ کسی کی منگنی پر دوسرے کا منگنی نہ کرنا۔ (صحیح بخاری:5144)

7۔ کسی کے سودے (بیع) پر دوسرے کا سودا نہ کرنا۔ (صحیح بخاری:2139)

8۔ مردوں کے لیے سونے کا استعمال کا حرام ہونا۔ (سنن ترمذی:1720)

9۔ مردوں کے لیے ریشم کا لباس پہننے کی ممانعت و حرمت۔ (صحیح بخاری:5833، ترمذی:1720)

10۔ شہید کی میت کو غسل نہ دینا اور اُسے کفن نہ پہنانا۔ (صحیح بخاری:1347، سنن ابی داؤد:3133)

11۔ کسی مسلمان مرد کے لیے اپنی پھوپھی، بھتیجی یا خالہ، بھانجی کو بیک وقت نکاح میں رکھنے کا حرام ہونا۔ (صحیح بخاری:5109)

12۔ پالتو گدھے، کچلی والے درندے اور پنجے والے شکاری پرندوں کا گوشت حرام ہونا۔ (صحیح بخاری:3155)

13۔ نمازِ تراویح۔ (صحیح بخاری:1147)

14۔ نمازِ استسقا (صحیح بخاری:1005)

15۔ نمازِ کسوف (صحیح بخاری:1041)

16۔ کسی نبی کو اُس جگہ دفن کرنا جہاں اُس کی وفات ہوئی ہو۔ (سنن ترمذی:1018)

17۔ مختلف قسم کے اموال پر زکوۃ کے نصابات (دیکھئے کتب حدیث)

18۔ سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد آمین کہنا۔ (صحیح ابن حبان:1802)

19۔ مریض کی عیادت کرنا۔ (صحیح بخاری:1240)

20۔ مردہ مچھلی کا حلال ہونا۔ (صحیح بخاری:4362)

21۔ جوتا پہنتے وقت پہلے دائیں پاؤں میں جوتا پہننا اور اُتارتے وقت پہلے بائیں پاؤں سے جوتا اُتارنا۔ (صحیح بخاری:5856)

22۔ مسجد میں داخل ہوتے وقت دعا کرنا اور مسجد سے باہر نکلتے وقت دعا کرنا۔ (صحیح مسلم:713)

23۔ نومولود کو گھٹی دینا۔ (صحیح بخاری:5467)

24۔ حج مبرور کی جزا جنت ہے! (صحیح بخاری:1773)

25۔ وضو میں موزوں اور جرابوں پر مسح کرنا۔ (صحیح بخاری:205، سنن ابی داؤد:146)

یہ اور اس طرح کے سینکڑوں دینی اعمال و احکام ہیں جو صرف صحیح حدیث سے ثابت ہوتے ہیں اور ان کو دینی اعمال و احکام یا سنت سے خارج سمجھنا (جیسا کہ غامدی صاحب سمجھتے ہیں) اسلام سے ناواقفیت اور پرلے درجے کی جہالت ہے۔

البتہ یہ بات ضرور پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کسی حدیث کو صرف اسی صورت میں قبول کیا

جائے گا جب وہ صحیح طور پر ثابت ہو۔ ضعیف اور موضوع قسم کی کسی حدیث سے دین کا کوئی حکم یا عمل ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

حدیث کی اہمیت اور حجیت ایک مسلمہ دینی امر ہے اور غامدی صاحب دین کے مسلمات ہی کے منکر ہیں۔ اس لیے وہ ہمارے نزدیک نہ صرف منکر حدیث ہیں بلکہ منکر دین بھی ہیں۔ حدیث سے محرومی پورے دین سے محرومی ہے۔ دین ایک اکائی ہے اور اس کے کسی ایک جزو کا انکار اس کے کل کا انکار ہے۔ آپ یہ نہیں کر سکتے کہ اسلام کے بعض عقائد و اعمال کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں آپ کو یا تو اسلام کے تمام عقائد و اعمال کو تسلیم کرنا ہوگا یا سب کو ترک کرنا ہوگا۔ آدھا، پونا، تہائی اور دو تہائی اسلام ایک بے معنی چیز ہے۔ دین اسلام میں اگر آپ حدیث کو چھوڑ دیں گے تو آپ کو پورے دین اسلام سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور کوئی مسلمان بقائمی ہوش و حواس اپنے آپ کو دین سے محروم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔

غامدی صاحب کو سوچنا چاہیے کہ حدیث کے بارے میں وہ اپنا عجیب و غریب نظریہ اختیار کرنے کے بعد کہاں کھڑے ہیں؟ دائرۂ اسلام کے اندر یا دائرۂ اسلام کے باہر؟ کیونکہ دائرۂ اسلام کے اندر تمام اہل اسلام، اسلام کے بیشتر عقائد اور اعمال و احکام حدیث ہی سے لیتے ہیں جبکہ غامدی صاحب حدیث سے کوئی عقیدہ یا عمل یا حکم لینے ہی کے منکر ہیں۔

قرآن میں کئی مقامات پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرنے کا حکم موجود ہے۔ جو حدیث کی پیروی کا دوسرا نام ہے:

1۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا کہ:

﴿يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَأَطِيعُواْ ٱلرَّسُولَ وَلَا تُبْطِلُوٓاْ أَعْمَٰلَكُمْ﴾ (محمد: 33)

”اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور ان (دونوں کی نافرمانی کرکے) اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔“

2۔ دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ (الحشر: 7)

"رسول ﷺ جو کچھ تمہیں دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اُس سے رُک جاؤ۔"

یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے ہر فرمان کو واجب الاطاعت قرار دیتی ہے۔ جس کا مطلب یہ کہ ہر صحیح حدیث کو ماننا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

3۔ بلکہ یہاں تک فرما دیا گیا کہ جس شخص نے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کر لی تو اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر لی۔

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾ (النساء: ٨٠)

"جو شخص رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کر لے، اُس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر لی۔"

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ چونکہ غامدی صاحب کے نزدیک:

1۔ حدیث صرف اخبارِ آحاد کا نام ہے اور اس میں اخبارِ متواترہ شامل نہیں۔

2۔ حدیث اور دین دو الگ الگ چیزیں ہیں اور حدیث کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

3۔ کسی حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔

4۔ کسی حدیث سے دین کا کوئی عمل اور حکم ثابت نہیں ہوتا۔

لہٰذا ہماری رائے میں غامدی صاحب اپنے مذکورہ بالا نظریات رکھنے کی بنا پر منکرِ حدیث قرار پاتے ہیں اور ان کا شمار منکرین حدیث میں ہو جاتا ہے، کیونکہ حدیث کے بارے میں اُن کا نظریہ پوری امت مسلمہ کے تصورِ حدیث کے خلاف ہے۔



باب نمبر 6:

کیا حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے گا؟

جناب جاوید غامدی صاحب نت نئے حربوں کے ذریعے حدیث کی حجیت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کبھی حدیث اور سنت میں تفریق پیدا کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا اُسوۂ حسنہ اور حدیث دو الگ الگ اور مختلف چیزیں ہیں۔ کبھی فرماتے ہیں حدیث سے دین کا کوئی عقیدہ، عمل اور حکم ثابت نہیں ہوتا۔ کبھی ارشاد ہوتا ہے سنت خبر واحد (اخبار آحاد) سے ثابت نہیں ہو سکتی اس کے لیے تواتر شرط ہے۔ اس طرح وہ مختلف حیلوں بہانوں سے حدیث کی اہمیت گھٹاتے اور اسے دین اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

آج ہم اُن کے ایک اور نرالے اصول حدیث کا علمی جائزہ لیں گے جس کو وہ فہم حدیث اور تدبر حدیث کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں مگر اس سے اُن کا اصل مقصد اور مدعا بھی انکارِ حدیث ہے۔ اُن کا وہ نرالا اصول حدیث یہ ہے کہ:

''حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے۔''

چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''دوسری چیز یہ ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے۔ دین میں قرآن کا جو مقام ہے وہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی حیثیت نبوت و رسالت میں جو کچھ کیا، اس کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ بھی قرآن ہی ہے۔ لہٰذا حدیث کے بیشتر مضامین کا تعلق اس سے وہی ہے جو کسی چیز کی فرع کا اُس کی اصل سے اور شرح کا متن سے ہوتا ہے۔ اصل اور متن کو دیکھے بغیر اس کی شرح اور فرع کو سمجھنا ظاہر ہے کہ کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔

حدیث کو سمجھنے میں جو غلطیاں اب تک ہوئی ہیں، ان کا اگر دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت صاف واضح ہو جاتی ہے۔ عہد رسالت میں رجم کے واقعات، کعب بن اشرف کا قتل، عذابِ قبر اور شفاعت کی روایتیں، "اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ" اور "مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ" جیسے احکام اسی لیے اُلجھنوں کا باعث بن گئے کہ انہیں قرآن میں ان کی اصل سے متعلق کر کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ حدیث کے فہم میں اس اصول کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کی بیشتر اُلجھنیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں۔" (میزان، ص 64، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی، ص 27، طبع فروری 2005ء، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک:

1۔ حدیث فہمی کے لیے ایک اصول یہ ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے کیونکہ اُن کے نزدیک قرآن اور حدیث میں اصل اور اُس کی فرع کا تعلق ہے یا پھر متن اور اُس کی شرح کا۔

2۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ حیثیت سے جو کام کیا اُس کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ قرآن ہے۔

3۔ عہد رسالت میں رجم کے واقعات، کعب بن اشرف کا قتل، عذابِ قبر اور شفاعت کی روایتیں، اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ اور مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ جیسے احکام علمائے اسلام کے لیے اُلجھنوں کا باعث اس لیے بن گئے کہ انہوں نے فرع (حدیث) کو اصل (قرآن) سے متعلق کر کے سمجھنے کا ''اصول حدیث'' نہیں اپنایا تھا۔

4۔ حدیث کو سمجھنے میں اب تک بہت غلطیاں ہوئی ہیں۔

اب ہم ان چاروں نکات پر تفصیلی جائزہ لیں گے۔

1۔ کیا حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے گا؟

فہم حدیث کے بارے میں غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں

سمجھا جائے گا کیونکہ اُن کے نزدیک قرآن اور حدیث میں اصل اور اُس کی فرع کا تعلق ہے یا پھر متن اور اُس کی شرح کا...... تو یہ ان کی اپنی ذہنی اختراع ہے جس کا مقصد انکارِ حدیث کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ علمائے اسلام کے ہاں یہ اصول تفسیر تو مسلمہ ہے کہ قرآن کو حدیث کی روشنی میں سمجھنا چاہیے کہ اس سے قرآن کے مجمل احکام کی وضاحت ملتی ہے مگر آج تک اہل علم میں سے کسی نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا بھی کوئی اصول حدیث ہے اور یہ کہ قرآن اور حدیث میں اصل اور اُس کی فرع کا تعلق ہے یا پھر متن اور اُس کی شرح کا۔

مثال کے طور پر قرآن مجید میں نماز کا حکم اس طرح دیا گیا ہے کہ:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (النور: 56)

''اور نماز قائم کرو۔''

قرآن کے اس مجمل حکم کو احادیث کی روشنی میں اس طرح سمجھا جائے گا کہ اس سے مراد دن رات میں پانچ مخصوص اوقات...... فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی فرض نمازیں مراد ہیں جن میں بالترتیب دو، چار، چار، تین اور چار فرض رکعات پڑھی جائیں گی اور ان نمازوں کے پڑھنے کا مسنون طریقہ ہے جو تکبیر تحریمہ سے لے کر قیام، رکوع، سجود، اور قعدہ اخیرہ کے بعد دائیں بائیں سلام پھیرنے تک کا ہے۔ اس طرح حدیث کی روشنی میں قرآن پاک کے مجمل حکم ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ (اور نماز قائم کرو) کا اصل منشا اور صحیح مدعا سمجھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح زکوۃ کے بارے میں قرآن مجید میں حکم ہے کہ:

﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (النور: 56)

''اور زکوۃ ادا کرو۔''

قرآن مجید کے اس مجمل حکم کو حدیث کی روشنی میں اس طرح سمجھا جائے گا کہ زکوۃ سے مراد وہ مخصوص مال ہے جسے ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں سے مقررہ نصاب کے مطابق اُس کے مستحق لوگوں کے لیے نکالتا ہے۔ یہ زکوۃ سونے اور چاندی

(نقدی)، مالِ تجارت، زرعی پیداوار اور مویشی وغیرہ پر دی جاتی ہے۔ سونے نصاب $7\frac{1}{2}$ تولے اور چاندی کا نصاب $52\frac{1}{2}$ تولے ہے۔ ان دونوں پر ڈھائی فی صد ($2\frac{1}{2}\%$) یعنی چالیسواں حصہ کے حساب سے سالانہ زکوٰۃ ادا ہوگی۔ نقدی اور مالِ تجارت کے لیے بھی یہی شرح ہے۔ زرعی پیداوار میں سے بعض پر عشر اور بعض پر نصف عشر ادا کیا جائے گا اور اس کے لیے سال گزرنے کی شرط نہیں ہے بلکہ یہ فصل کٹنے پر فرض ہو جاتا ہے۔ مویشیوں میں سے اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری پر ان کی مختلف تعداد کے لحاظ سے نصاب کے مطابق سالانہ زکوٰۃ ہے۔ لہٰذا احادیث کی ان تفصیلات کی روشنی میں قرآن کے اس مجمل حکم ﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (اور زکوٰۃ ادا کرو) کو سمجھا جائے گا۔ اسی طرح قرآن مجید کے دوسرے احکامات کو احادیث کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

لیکن اگر غامدی صاحب کے بنائے ہوئے اس اصولِ حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو اس کے نتیجے میں نوے فی صد (90%) احادیث صحیحہ کا انکار کرنا پڑے گا کیونکہ وہ قرآن کی روشنی میں سمجھی نہیں جاسکتیں اس لیے کہ وہ قرآن میں موجود ہی نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر درج ذیل صحیح احادیث ایسی ہیں جن کو قرآن میں تلاش نہیں کیا جاسکتا مگر یہ ایسی ہیں جن کو علمائے اسلام چودہ سو برس سے مانتے آرہے ہیں اور امت مسلمہ ان پر عمل پیرا رہی ہے۔

1۔ مردوں کے لیے ریشم اور سونے کا حرام ہونا۔

2۔ پالتو گدھے کے گوشت کا حرام ہونا۔

3۔ کتے کا گوشت حرام ہونا۔

4۔ مرتد کے لیے قتل کی سزا ہونا۔

5۔ شادی شدہ زانی کے لیے رجم (سنگساری) کی حد (سزا)۔

6۔ شراب، مردہ جانور اور بتوں کی تجارت کا حرام ہونا۔

7۔ عورت کے لیے خاص ایام میں نمازیں نہ پڑھنا اور بعد میں اُن کی قضا نہ کرنے کا حکم۔

8۔ حیض کی حالت میں بیوی سے بوس و کنار کی اجازت ہونا۔
9۔ شہید کی میت کو غسل نہ دینا اور اُس کو کفن نہ پہنانا۔
10۔ قرآن پڑھنے کے دوران اُس کے بعض مقامات پر سجدۂ تلاوت کرنا۔
11۔ سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد آمین کہنا۔
12۔ مردہ مچھلی کا حلال ہونا۔
13۔ وضو کرتے وقت موزوں پر مسح کرنا۔ (مسح علی الخفین)
14۔ کسی عورت اور اس کی پھوپھی یا خالہ کا بیک وقت کسی مرد کے نکاح میں ہونا حرام ہے۔
15۔ قاتل شخص کا مقتول کی وراثت سے محروم ہونا۔
16۔ وارث کے حق میں وصیت کا ناجائز ہونا۔
17۔ ایک تہائی سے زیادہ وصیت کرنے کی ممانعت۔
18۔ مسلمان اور کافر کا ایک دوسرے کے لیے وارث نہ ہونا۔
19۔ شراب نوشی پر سزا ہونا۔
20۔ مکہ مکرمہ کی طرح مدینہ منورہ کا حرام ہونا۔
21۔ ذمی (غیر مسلم اقلیت) کے حقوق۔
22۔ مریض کی عیادت کرنا۔

یہ اور اس طرح کی بے شمار احادیث ہیں جن کو امت مانتی اور ان پر عمل کرتی ہے حالاں کہ ان کا ثبوت قرآن مجید سے نہیں ہوتا۔

اب اگر غامدی صاحب کے بنائے ہوئے اصول حدیث کو درست تسلیم کرلیا جائے تو ایسی بے شمار احادیث کا انکار کرنا پڑے گا کیونکہ جب کوئی شخص ان احادیث کو قرآن میں نہیں پا سکے گا تو لامحالہ وہ ان کا انکار کر کے منکر حدیث ہو جائے گا یا پھر غامدی صاحب کے اس گھڑے ہوئے مذکورہ اصول حدیث ہی پر لعنت بھیجے گا کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔ کیونکہ قرآن نے رسول اللہ ﷺ کی غیر مشروط واطاعت کا حکم دیا ہے۔ (النساء:59)

اسی طرح غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ قرآن اور حدیث میں اصل اور اُس کی فرع کا یا متن اور اُس کی شرح کا تعلق ہے تو مذکورہ بالا احادیث کے احکام اگر فرع ہیں تو ان کی اصل کہاں ہے اور اگر وہ شرح ہیں تو اُن کا متن قرآن مجید میں کہاں موجود ہے؟ پھر اگر یہ دونوں چیزیں وہاں نہ مل سکیں اور یہ کبھی نہیں مل سکتیں تو کیا پھر یہ اعلان کر دیا جائے کہ غامدی صاحب کے بتائے ہوئے اصول حدیث کے مطابق ایسی تمام احادیث نا قابل اعتبار ہیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سمیت پوری امت مسلمہ ان سب روایات کو مان کر چودہ سو برس سے گمراہی میں بھٹک رہی ہے؟ العیاذ باللہ!

2۔ کیا نبی کریم ﷺ کے پیغمبرانہ کام کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ صرف قرآن ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پیغمبرانہ کام کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ صرف قرآن ہے کیونکہ:

1۔ یہ حقیقت اہل علم سے ہرگز پوشیدہ نہیں ہے کہ قرآن مجید بجائے خود کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ وہ بنیادی طور پر ہدایت کی کتاب ہے اور اس میں تاریخی واقعات واحوال ضمنی طور پر آئے ہیں جن کا مقصد عبرت اور سبق آموزی ہے۔

یہ درست ہے کہ نبی کریم ﷺ کی سیرت کے کچھ پہلو اجمالی طور پر قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں لیکن یہ دعویٰ محل نظر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سارے پیغمبرانہ کام کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ صرف قرآن ہے اور جو نبوی کام قرآن میں نظر نہ آئے تو اس سے انکار کر دیا جائے کہ یہ آپ ﷺ کا پیغمبرانہ کام نہیں ہے۔

اگر غامدی صاحب کے اس دعوے کو درست تسلیم کر لیا جائے تو امت مسلمہ کو نبی کریم ﷺ کی سیرت کے بہت سے واقعات کا انکار کرنا پڑے گا اور احادیث صحیحہ کے بہت بڑے ذخیرہ سے محروم ہونا پڑے گا۔

مثال کے طور پر درج ذیل پیغمبرانہ کاموں کی تاریخ قرآن مجید میں موجود نہیں ہے:

1۔ قرآن مجید کی نزولی ترتیب کے بعد موجودہ تلاوت کی ترتیب قائم کرنا۔

2۔ کاتبین وحی کے ذریعے قرآن مجید کی کتابت کرانا۔

3۔ وضو میں پاؤں دھونے کی بجائے موزوں پر مسح کرنا۔

4۔ فرض نمازوں سے پہلے اذان اور اُس کا طریقہ۔

5۔ فرض نمازوں کی رکعات کا تعین۔

6۔ سری اور جہری نمازوں میں فرق کرنا۔

7۔ سجدہ سہو اور اُس کا طریقہ۔

8۔ حالت حیض میں بیوی سے بوس و کنار کی اجازت دینا۔

9۔ حج کے لیے میقات (مواقیت) کی تعیین۔

10۔ میت کی نماز جنازہ پڑھنے کا حکم۔

11۔ دعا کے وقت ہاتھ اُٹھانا۔

12۔ درجنوں بادشاہوں اور حکمرانوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے خطوط بھیجنا اور اُن پر مہر ثبت کرنا۔

13۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت حبشہ کی اجازت دینا۔

14۔ نجاشی کا مسلمان ہونا اور اُس کی وفات پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھنا۔

15۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا 27 غزوات میں شرکت فرمانا۔

16۔ خطبہ حجۃ الوداع۔

تو کیا ان جیسے بے شمار پیغمبرانہ امور کا صرف اس لیے انکار کر دیا جائے گا کہ ان کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ قرآن نہیں ہے اور یہ قرآن میں موجود نہیں ہیں اس لیے یہ سب غلط اور بے اصل ہیں۔ غامدی صاحب ہوش کے ناخن لیں وہ کیسے دعاوی کرتے ہیں۔

3۔ کیا عہد رسالت کے بعض احکام امت کے لیے اُلجھن کا باعث بن گئے؟

غامدی صاحب فرماتے ہیں کہ عہد رسالت میں رجم کے واقعات، کعب بن اشرف کا

قتل، عذابِ قبر، شفاعت کی روایتیں، "اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ" اور "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" جیسے احکام امت کے لیے اُلجھنیں بن گئیں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام امور غامدی صاحب کی اپنی کھوپڑی کے لیے تو اُلجھنیں ہو سکتی ہیں مگر یہ سب چیزیں امت مسلمہ اور علمائے اسلام کے دل و دماغ میں کبھی اُلجھنیں نہیں رہیں ہمیشہ بالکل واضح رہی ہیں اور اب ہم ان امور پر بھی تفصیلی بحث کریں گے جن کو غامدی صاحب اُلجھنیں قرار دیتے ہیں:

1۔ عہد نبوی میں شادی شدہ زانیوں پر رجم یعنی سنگساری کی حد جاری کی گئی اور غیر شادی شدہ زانیوں کو سو کوڑوں کی سزا دی گئی۔ بتایئے اس بارے میں کون سی اُلجھن ہے؟

2۔ یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل کا واقعہ صحیحین کے علاوہ سیرت ابن ہشام میں بھی موجود ہے۔ اس شخص نے دوسری شرارتوں کے علاوہ نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے کی تدبیریں اور سازشیں کی تھیں جس کے نتیجے میں ایک صحابی سیّدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے اجازت لے کر اُسے قتل کر دیا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی نے بھی سیرت النبی ﷺ میں لکھا ہے کہ:

"فتنہ انگیزی کا زیادہ اندیشہ ہوا تو آپ ﷺ نے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے شکایت کی اور آپ ﷺ کی مرضی سے سیّدنا محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے بہ مشورہ رؤسائے اوس جا کر اُس (کعب بن اشرف) کو ربیع الاوّل ۳ھ میں قتل کر دیا۔"

(سیرت النبی ﷺ، جلد اوّل، ص 233، طبع لاہور)

مورخ اسلام اکبر شاہ خان نجیب آبادی نے لکھا ہے کہ:

"جب کعب بن اشرف کی شرارتیں حد سے بڑھ گئیں تو ایک صحابی محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے اس شریر کے قتل کی اجازت لینے کے بعد کئی اور دوستوں کو ہمراہ لیا اور اس کے گھر جا کر اس کو قتل کیا۔"

(تاریخ اسلام از اکبر شاہ خان، جلد اوّل، ص 176، طبع لاہور)

بتایئے اس واقعے میں کیا اُلجھن ہے؟

3۔ عذابِ قبر کے بارے میں صحیح اور مستند احادیث موجود ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے مجرموں کے لیے دوزخ کے قید خانے کی اصل سزا سے پہلے اُن کو عالم برزخ کی حوالات میں رکھنے کی حالت ہے۔ بتایئے اس میں کیا اُلجھن ہے؟ جبکہ خود قرآن مجید میں بھی عذابِ قبر کے بارے میں واضح اشارہ موجود ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْا آلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ (المومن: 46)

''ان لوگوں کو (عالم برزخ میں) صبح وشام دوزخ کی آگ کے سامنے کھڑا کیا جاتا ہے اور جس دن قیامت قائم ہوگی تو حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو سخت ترین عذاب میں ڈالا جائے۔''

4۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ آخرت میں مسلمان گناہ گاروں کے لیے نبی کریم ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ قرآن مجید سے بھی اس شفاعت کے حق میں دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے شفاعت ہو سکے گی جیسا کہ آیت الکرسی میں ہے کہ:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ (البقرہ: 255)

''ایسا کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کرے۔''

اس میں ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ کا استثنا موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی جناب میں شفاعت ممکن ہے۔ اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوا کہ:

﴿مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْ بَعْدِ اِذْنِهٖ﴾ (یونس: 3)

''اُس (اللہ) کی اجازت کے بغیر کوئی شفاعت کرنے والا نہیں۔''

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے شفاعت ہو سکتی ہے اور احادیث صحیحہ کے مطابق نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ ہی کی اجازت سے اپنی امت کے لیے

شفاعت فرمائیں گے۔ بتائیے اس میں کیا اُلجھن ہے۔

5۔ حدیث "أُمِرْتُ اَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ" (مجھے حکم دیا گیا کہ میں (کافر) لوگوں سے جنگ کروں) صحیحین میں موجود ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو کفار کے خلاف جہاد و قتال کا حکم دیا گیا ہے اور اسی کے مطابق آپ ﷺ نے کفار کے خلاف عملی طور پر جہاد و قتال کیا ہے اور یہ قرآن مجید کا بھی حکم ہے۔ بتائیے اس میں کیا اُلجھن ہے؟

6۔ "مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ" (جو شخص اپنا دین بدل ڈالے تو اُسے قتل کر دو) اور اسی مضمون کی چند اور صحیح احادیث میں بھی مرتد کی سزا کا قانون بیان ہوا ہے۔ اس قانون کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی نافذ کیا ہے اور اس پر اُمت مسلمہ کا اجماع قطعی موجود ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ بتائیے اس میں کیا اُلجھن ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ غامدی صاحب منکر حدیث ہیں اور وہ اُلجھنوں کے نام سے بھی صحیح احادیث کی غلط تاویلیں کرتے اور اُن کا انکار کرتے ہیں اور یہ بھی اُن کا ایک طریق واردات ہے۔ جو وہ اپنی میزان نامی کتاب کے ذریعے استعمال کرتے ہیں۔ ع

عدل کا جس کے بہت چرچا سنا تھا ہم نے
اُس کے انصاف کے بھی کتنے ترازو نکلے

4۔ کیا حدیث کو سمجھنے میں اب تک غلطیاں ہوئی ہیں؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی محلِ نظر ہے کہ حدیث کو سمجھنے میں اب تک غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، خیر القرون کے سلف صالحین اور ان کے بعد صدیوں تک امت مسلمہ کے محدثین، فقہا اور مجتہدین بیچارے ساری عمر یہ حسرت اپنے دلوں میں لیے اسی انتظار میں دنیا سے رخصت ہو گئے کہ کب جاوید غامدی (اصل میں ککے زئی) پنجاب کے ایک گاؤں میں جنم لیں اور پھر ان سب کو حدیث پر غور و تدبر کرنے کے صحیح اصول سکھائیں تاکہ حدیث کو سمجھنے میں کسی قسم کی غلطی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

کیا کوئی معقول آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ پوری امت مسلمہ تو آج تک حدیث کو سمجھنے میں غلطیاں کرتی چلی آ رہی ہے اور وہ خود حدیث کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کر سکتا کیونکہ اُس کی جیب میں ایسے اصول حدیث رکھے ہیں جو آسمان سے نازل ہوئے ہیں اور خود اس پر الہام ہوتا ہے جس میں کسی غلطی کا کوئی شائبہ تک نہیں؟ اس طرح کا دعویٰ کرنا علمیت کی نہیں جہالت کی دلیل ہے۔

اگر امت مسلمہ چودہ صدیوں سے حدیث کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی تو جناب غامدی کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ وہ حدیث کو جو کچھ سمجھتے ہیں وہی حرفِ آخر ہے۔ کیا وہ اپنے آپ کو عقل کل سمجھتے ہیں؟ یا اُنہیں اپنے بارے میں معصوم عن الخطا ہونے کا زعم ہے؟

ان کی حدیث فہمی کا حال جاننے کے لیے ایک مثال ہی کافی ہے۔

صحیح احادیث کے مطابق شادی شدہ زانی کی سزا رجم یعنی سنگساری ہے اور اسی پر اجماع امت ہے۔ مگر انہی احادیث کو جب غامدی صاحب اپنے خانہ ساز حدیث کے اصولوں کی روشنی میں سمجھتے ہیں تو ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اسلام میں رجم یعنی سنگساری کی حد کسی شادی شدہ شخص کے جرم زنا کی سزا نہیں ہے بلکہ یہ بدمعاشی کی سزا ہے۔ حالاں کہ رجم سے متعلق احادیث صحیحہ سے ایسا نتیجہ نکالنا بجائے خود بدمعاشی ہے۔

اسی طرح کا سلوک وہ دوسری تمام احادیث سے کرتے ہیں اور ان کو دین سے خارج سمجھتے ہیں اور اُن سے ثابت شدہ کسی عقیدے، عمل اور حکم کو ضروری اور واجب الاطاعت تسلیم نہیں کرتے۔ کیا یہ انکارِ حدیث نہیں ہے؟



باب نمبر 7:

کیا حدیث سے
قرآن کے کسی حکم کی تخصیص وتحدید ہو سکتی ہے؟

غامدی صاحب کے انکارِ حدیث کا سلسلہ بہت طولانی ہے۔ وہ فہم حدیث کے لیے اپنے من گھڑت اصول رکھتے ہیں جن کا نتیجہ انکار حدیث کی صورت میں نکلتا ہے۔ وہ حدیث اور سنت کی مسلمہ اصطلاحات کا مفہوم بدلنے کا ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ حدیث کو دین کا حصہ نہیں سمجھتے۔ وہ اس کے ثبوت کے لیے اپنی طرف سے اجماع اور تواتر کی شرائط عائد کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں نبی کریم ﷺ نے حدیث کی حفاظت اور تبلیغ و اشاعت کا کوئی اہتمام نہیں فرمایا تھا۔ حدیث وسنت کے بارے میں اُن کے ہاں کھلے تضادات بھی پائے جاتے ہیں۔

انکارِ حدیث کے حوالے سے وہ حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تخصیص وتحدید واقع ہونے کو بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

''قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اُس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم وتغیر نہیں کرسکتا۔ دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ اس کی آیات بینات ہی کی روشنی میں ہوگا۔'' (میزان، ص 25، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول ومبادی، ص 24، طبع فروری 2005ء، لاہور)

اپنے اس دعوے کے بارے میں وہ مزید لکھتے ہیں کہ:

''حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوءِ فہم اور

قلت تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے۔ (میزان، ص 35، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(اصول و مبادی، ص 36، طبع فروری 2005ء، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کے نزدیک:

1۔ دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ صرف قرآن کی روشنی میں ہوگا۔

2۔ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص نہیں ہو سکتی۔

3۔ اگر قرآن کے کسی حکم میں حدیث سے تحدید و تخصیص مان لی جائے تو اس سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ اور مشکوک ہو جاتا ہے۔

اب ہم غامدی صاحب کے ان دعاوی کا علمی جائزہ لیں گے۔

1۔ کیا دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ صرف قرآن کی روشنی میں ہوگا؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ صرف قرآن کی آیات بینات کی روشنی میں ہوگا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خود قرآن مجید ہی ان کے اس دعویٰ کی تردید کر دیتا ہے۔ وہ ہر معاملے کے فیصلے کے لیے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیتا ہے۔ گویا دوسرے لفظوں میں دین کے ہر معاملے کا فیصلہ قرآن اور حدیث و سنت کی روشنی میں کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾

(النساء: 59)

”اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول ﷺ کی اور اُن کی

جو تم میں سے اہلِ اختیار ہیں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو اگر تم واقعی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔''

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے کہ اہلِ ایمان کے درمیان کسی بھی مسئلے کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لیے اللہ و رسول ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کے ہر معاملے میں ردّ و قبول کا فیصلہ قرآن اور حدیث و سنت کی روشنی میں ہوگا نہ کہ صرف قرآن کی روشنی میں۔

چنانچہ غامدی صاحب کے استاد مولانا امین احسن اصلاحی نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ:

''فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ'' کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی امر میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہو تو پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو نبی کی سنت کی طرف رجوع کرے۔ اگر اس میں نہ ملے تو پھر اس کے معلوم کرنے کا راستہ اجتہاد ہے۔''

(تدبر قرآن، جلد 2، ص 325، طبع 1983ء، لاہور)

پھر مولانا اصلاحی نے اس آیت کی مزید تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ قانون اسلامی کے مرجع کی حیثیت سے کتاب اللہ کی طرح سنت رسول ﷺ کی حیثیت بھی مستقل اور دائمی ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (پس اس کو اللہ و رسول ﷺ کی طرف لوٹاؤ) ظاہر ہے کہ یہ ہدایت نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ہی تک کے لیے محدود نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اس اختلاف کے پیدا ہونے کا غالب امکان تو رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہی تھا اور آیت

خود شہادت دے رہی ہے کہ اس کا تعلق مستقبل ہی سے ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی سنت ہی ہے جو آپ ﷺ کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔" (تدبر قرآن، جلد 2، ص 326، طبع 1983ء، لاہور)

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب کا یہ دعوی کہ دین میں ہر چیز کے ردّ و قبول کا فیصلہ صرف قرآن کی روشنی میں ہوگا، ایک بے اصل اور غلط دعوی ہے جو قرآن مجید کے بھی خلاف ہے، سنت کے بھی خلاف ہے، اجماع صحابہ و اجماع امت کے بھی خلاف ہے اور خود اُن کے اپنے استاد کے موقف کے بھی خلاف ہے۔

2۔ کیا حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص ہو سکتی ہے؟

غامدی صاحب کا یہ دعویٰ بھی بالکل غلط ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآن مجید کے بہت سے احکام کی تحدید اور تخصیص ہوئی ہے اور اہل علم کے ہاں اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حدیث سے قرآنی حکم کی تحدید کی مثالیں:

حدیث کے ذریعے قرآن مجید کے کئی احکام میں تحدید واقع ہوئی ہے۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

1۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلًا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیًّا كَبِیْرًا﴾ (النساء: 34)

"اور جن بیویوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو اُنہیں سمجھاؤ، ان سے ہم بستری چھوڑ دو اور (اس پر نہ مانیں تو) انہیں مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف الزام تراشی نہ کرو۔ بے شک اللہ سب سے برتر اور بہت بڑا ہے۔"

اس آیت کے الفاظ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ (اور ان بیویوں کو مارو) مطلق تھے اور یہ مارنا ہر طرح کا مارنا اور زخمی کرنا ہوسکتا تھا لیکن حدیث کے ذریعے قرآن کے اس مطلق حکم میں یہ تحدید (تقیید) ہوگئی ہے کہ صرف ایسی مار جائز ہے جو اتنی تکلیف دہ نہ ہو کہ اُس سے کسی عضو کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

((فَاضۡرِبُوۡهُنَّ ضَرۡبًا غَيۡرَ مُبَرِّحٍ .)) (صحیح مسلم: حدیث 2950)

"پس تم ان کو اتنا مار سکتے ہو جو ایسا تکلیف دہ نہ ہو کہ اس سے ان کے کسی عضو کو کوئی نقصان پہنچے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تحدید ہو سکتی ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ خود غامدی صاحب نے اپنے اسی مزعومہ اصول حدیث کے خلاف حدیث کے ذریعے قرآن کی مذکورہ آیت کے حکم وَاضۡرِبُوۡهُنَّ (اور ان بیویوں کو مارو) کی تحدید مانی ہے کہ اس سے مراد صرف ایسی سزا ہے جو پائیدار اثر نہ چھوڑے۔ چنانچہ وہ اپنی ڈنڈی مار کتاب "میزان" اور "قانون معاشرت" میں لکھتے ہیں کہ:

"نبی کریم ﷺ نے اس کی حد غیر مبرح کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی سزا نہ دی جائے جو کہ پائیدار اثر چھوڑے۔"

(میزان، ص 423، طبع سوم 2008ء لاہور)

(قانونِ معاشرت، ص 30، طبع اول مئی 2005ء، لاہور)

دین کے بارے میں ایسے کھلے تضاد کا حامل ہونا صرف غامدی صاحب ہی کو زیب دیتا ہے۔ جو خود ایک اصول بناتے اور پھر خود ہی اسے توڑ ڈالتے ہیں۔

2۔ قرآنی حکم میں حدیث کے ذریعے تحدید کی دوسری مثال یہ ہے:

﴿وَيَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الۡمَحِيۡضِ قُلۡ هُوَ اَذًى فَاعۡتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الۡمَحِيۡضِ وَلَا تَقۡرَبُوۡهُنَّ حَتّٰى يَطۡهُرۡنَ﴾ (البقرہ: 221)

"اور وہ آپ ﷺ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ کہیں وہ ایک گندگی ہے لہٰذا اس میں بیویوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن کے قریب نہ جاؤ۔"

اس آیت میں یہ حکم ہے کہ ﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ﴾ (پس تم بیویوں سے اُن کے حیض کی حالت میں الگ رہو) یہ الگ رہنا ایک مطلق حکم ہے جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ایسی حالت میں بیویوں سے الگ تھلگ رہو، اُن کو کسی الگ مقام پر رکھو، ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دو اور ان سے میل جول نہ رکھو۔

لیکن اس بارے میں صحیح احادیث سے قرآن کے اس مطلق حکم کی تحدید ثابت ہے کہ ایسی حالت میں بیویوں سے صرف مباشرت منع ہے اس کے سوا سب کچھ جائز ہے۔

ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تحدید ہوسکتی ہے خود غامدی صاحب حدیث کے ذریعے قرآن کے اس مطلق حکم کی تحدید کو مانتے ہیں۔ چنانچہ وہ اسی حوالے سے ایک حدیث نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"انہی (سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ ہم میں سے کوئی حیض کی حالت میں ہوتی اور رسول اللہ ﷺ اس کے قریب آنا چاہتے تو ہدایت کرتے کہ حیض کی جگہ پر تہ بند باندھ لے، پھر قریب آجاتے۔" (بخاری: حدیث 296)

(میزان، ص 433، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(قانون معاشرت، ص 43، طبع اول، مئی 2005ء لاہور)

اس طرح غامدی صاحب پہلے اپنا یہ اصول حدیث بتاتے ہیں کہ حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تحدید نہیں ہوسکتی اور پھر اپنے اس اصول کی خود ہی خلاف ورزی کرتے ہوئے حدیث کے ذریعے قرآن کے احکام کی تحدید ثابت کرنے لگتے ہیں۔

حدیث سے قرآنی احکام میں تخصیص کی مثالیں:

حدیث کے ذریعے کسی قرآنی حکم میں تخصیص کا واقع ہونا اہل علم کے نزدیک ایک ثابت شدہ اور مسلمہ امر ہے۔ جیسے

1۔ تخصیص کی پہلی مثال:

﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ﴾ (النساء: 11)

''اللہ تعالیٰ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ (وراثت میں) ایک لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ دیا جائے۔''

اس آیت سے واضح ہے کہ اولاد ہر حال میں اپنے والدین کے ترکے کی وارث ہوگی۔ بیٹے کو بیٹی سے دگنا حصہ ملے گا۔

لیکن صحیح حدیث میں ہے کہ:

((لَا يَرِثُ الْقَاتِلُ شَيْئًا .)) (سنن ابی داود، کتاب الدیات، حدیث:4564)

''قاتل وارث نہیں ہوسکتا۔''

اس لیے اگر کوئی بدبخت لڑکا اپنے باپ کو قتل کردے گا تو مذکورہ حدیث کے حکم کے مطابق وہ اپنے مقتول باپ کی میراث سے محروم ہوجائے گا۔

قرآن کا حکم عام تھا کہ ہر بیٹا اپنے باپ کے ترکے کا وارث ہوگا مگر حدیث نے قاتل بیٹے کی تخصیص کردی کہ وہ اپنے باپ کے ترکے کا وارث نہیں ہوسکتا۔ یہی اسلامی شریعت ہے اور اہل علم کا اسی پر اتفاق اور اجماع ہے کہ قاتل کو مقتول کی وراثت سے محروم کردیا جائے گا۔

اس طرح حدیث نے قرآن کے ایک حکم عام میں گویا تخصیص کردی ہے۔

2۔ تخصیص کی دوسری مثال:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرہ: 275)

"اور اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔"

مذکورہ آیت ہر طرح کی تجارت کو حلال ٹھہراتی ہے کیونکہ اس میں عموم پایا جاتا ہے۔ لیکن صحیح بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے کہ:

((إِنَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ حَرَّمَ بَيْعَ الْخَمْرِ وَالْمَيْتَةِ وَالْخِنْزِيْرِ وَالْأَصْنَامِ .)) (صحیح بخاری، کتاب البیوع، حدیث:2236)

"بے شک اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے شراب، مردہ جانور، خنزیر اور بتوں کی تجارت کو حرام قرار دیا ہے۔"

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں شراب، مردہ جانور، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے۔ اب اگر قرآن کے حکم کو دیکھا جائے تو ہر قسم کی تجارت حلال ہے کیونکہ قرآنی الفاظ میں عموم ہے۔ لیکن قرآن کے اس حکم عام میں حدیث کے ذریعے سے یہ تخصیص ہوئی ہے کہ شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت حرام ہے اور قرآن میں جس تجارت کے حلال ہونے کا ذکر ہے اُس میں شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کی تجارت شامل نہیں ہے۔

اب اگر غامدی صاحب کے بتائے ہوئے اس اصول حدیث کو مانا جائے کہ حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص نہیں ہو سکتی تو پھر مذکورہ صحیح حدیث کا انکار کرنا پڑے گا اور اسلام میں شراب، مردار، خنزیر اور بتوں کو تجارت بھی حلال ماننی پڑے گی جو غامدی صاحب کی خود ساختہ شریعت میں تو حلال ہو سکتی ہے مگر اسلامی شریعت میں حلال نہیں ہو سکتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث سے قرآن کے کسی حکم میں تحدید و تخصیص کو نہ ماننا محض سوءِ فہم اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔

3۔ کیا حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی تحدید یا تخصیص ہونے سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے؟

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ اگر حدیث سے کسی قرآنی حکم کی تخصیص یا تحدید مان لی جائے تو اس سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حدیث کے ذریعے قرآنی احکام میں تخصیص اور تحدید واقع ہونے سے قرآن مجید کا فرقان ہونا قطعاً مشتبہ نہیں ہو جاتا بلکہ اس سے قرآنی احکام کی وضاحت ہو جاتی ہے اور ان کا صحیح مدعا اور منشا معلوم ہو جاتا ہے جیسا کہ اُوپر کی مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ قرآن کو میزان کہا گیا ہے تو یہ بالکل ایک غلط اور بے اصل بات ہے۔ قرآن نے اپنی صفت میزان کہیں بھی بیان نہیں فرمائی۔ امت کے معتمد اور ثقہ اہل علم میں سے کسی نے کبھی بھی میزان کو قرآن کی صفت قرار نہیں دیا۔ [1]

اسی طرح حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم میں تخصیص یا تحدید ہونے سے اُس کا فرقان ہونا بھی کسی طرح مشتبہ یا مشکوک قرار نہیں پاتا۔ فرقان بلاشبہ قرآن کا صفاتی نام ہے اور قرآن سے ثابت بھی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں بہت سے احکام مجمل طور پر بیان ہوئے ہیں اور حدیث ان کی تفصیل اور تشریح کرتی ہے۔ حدیث کے ذریعے قرآن کے بہت سے مجمل احکام کی وضاحت ہوتی ہے اور اس سے قرآن کا فرقان ہونا کسی طرح مشتبہ یا مشکوک نہیں ہو جاتا۔ یہ غامدی صاحب کا محض وہم ہے اور وہم کا کوئی علاج نہیں ہے۔



[1] اس بارے میں ہم نے اپنی کتاب "غامدی مذہب کیا ہے؟" میں ایک مضمون میں تفصیلی بحث کر دی ہے۔

باب نمبر 8:

کیا اسلام میں مرتد کے لیے قتل کی سزا نہیں ہے؟

غامدی صاحب نے مرتد کے لیے قتل کی سزا ہونے کا بھی انکار کیا ہے جس کا سبب محض انکارِ حدیث ہے۔

''ارتداد'' کے لغوی معنی ''لوٹ جانے'' اور ''پھر جانے'' کے ہیں۔ شرعی اصطلاح میں ارتداد کا مطلب ہے: ''دین اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لینا۔'' یہ ارتداد قولی بھی ہو سکتا ہے اور فعلی بھی۔ ''مرتد'' وہ شخص ہے جو دین اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لے۔

اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے جو صحیح احادیث، تعامل صحابہ اور اجماعِ اُمت سے ثابت ہے۔

مگر غامدی صاحب اس منصوص اور مسلمہ اجماعی امر کو نہیں مانتے اور مرتد کے لیے سزائے قتل ہونے کے منکر ہیں۔ ہم سب سے پہلے مرتد کے واجب القتل ہونے کے شرعی اور عقلی دلائل دیں گے، اس کے بعد غامدی صاحب کے موقف کا جائزہ لیں گے۔

صحیح احادیث:

نبی کریم ﷺ کے جن مستند فرامین کی بنا پر علمائے اُمت کا مرتد کی سزا قتل ہونے پر اجماع ہے، وہ درج ذیل ہیں:

1۔ صحیح بخاری میں سیّدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت:

((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ .)) (صحیح بخاری، حدیث:6922)

''جو (مسلمان) اپنا دین بدل لے، اُسے قتل کر دو۔''

اسی مضمون کی احادیث بعض جلیل القدر صحابہ کرام: سیّدنا ابو بکر صدیق، سیّدنا علی، سیّدنا

ابو موسیٰ اشعری، سیّدنا خالد بن ولید اور سیّدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم اجمعین سے بھی مروی ہیں۔
مذکورہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ سنن ابوداؤد، سنن ابن ماجہ اور موطا امام مالکؒ میں بھی موجود ہے۔

2۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث ہے کہ:

((عن عبداللّٰه قال: قال رسول الله ﷺ: " لا يحل دم امرئ مسلم يشهد أن لا إلٰه الا الله، وأنّي رسول الله إلا بإحدىٰ ثلاث: النفس بالنفس، والثيب الزاني، والمفارق لدينه التارك للجماعة .)) (صحیح بخاری، حدیث:2878)

"سیّدنا عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، سوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، دوسری یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو اور تیسری یہ کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جائے۔"

یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ سنن ابو داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی (4725) سنن ابن ماجہ، سنن دارمی اور مسند احمد بن حنبل میں بھی موجود ہے اور اسے سیّدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیّدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے بھی مرتد کے لیے قتل کی سزا ثابت ہوتی ہے۔

3۔ سنن ابوداؤد کی حدیث ہے کہ:

((عن ابي أمامة بن سهل قال: كنّا مع عثمان وهو محصور في الدار، وكان في الدار مدخل من دخله سمع كلام من على البلاط، فدخله عثمان، فخرج إلينا وهو متغير لونه، فقال: إنهم ليتواعدونني بالقتل آنفا، قال: قلنا يكفيكهم الله يا أمير

المؤمنين قال: ولم يقتلونني؟ سمعت رسول الله يقول: "لا يحل دم امرئ مسلم إلا بإحدى ثلاث: كفر بعد إسلام، أو زنا بعد إحصان، أو قتل نفس بغير نفس." فوالله ما زنيت في جاهلية ولا في إسلام قط، ولا أحببت أن لي بديني بدلا منذ هداني الله، ولا قتلتُ نفسا فبم يقتلونني؟))

(سنن ابوداود، کتاب الدیات، حدیث: 4502)

"سیّدنا ابوامامہ بن سہل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور دوسرے لوگ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے، جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے۔ اس گھر کا ایک راستہ تھا، جس کے اندر کھڑا آدمی گھر کی بالکونی پر کھڑے لوگوں کی بات آسانی سے سن سکتا تھا۔ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لائے، ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ باہر نکلے اور فرمایا: ابھی یہ لوگ مجھے قتل کردینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان کے مقابلے میں اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ پھر فرمایا: یہ لوگ مجھے کیوں قتل کردینا چاہتے ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، سوائے اس کے کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہو۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرے۔ (مرتد ہوجائے) یا شادی کے بعد زنا کرے، یا کسی کو ناحق قتل کردے۔ اللہ کی قسم! میں نہ تو جاہلیت میں زنا کا مرتکب ہوا اور نہ اسلام لانے کے بعد۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنا دین بدلنا کبھی پسند نہیں کیا جب سے اللہ نے مجھے ہدایت عطا فرمائی ہے۔ تیسرے یہ کہ میں نے کسی کو ناحق قتل بھی نہیں کیا۔ پھر یہ لوگ کس بنا پر مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟"

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے یہ امر بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام میں مرتد شخص واجب القتل ہوتا ہے۔ چنانچہ انہی احادیث صحیحہ کی بنا پر تمام فقہائے اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ

اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔

کتبِ احادیث (جن میں صحیح بخاری بھی شامل ہے) اور معتبر کتبِ تاریخ سے ثابت ہے کہ چاروں خلفائے راشدین نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں مرتدین کو ہمیشہ قتل کی سزا دی لیکن طوالت کے خوف سے ہم یہاں ان واقعات کی تفصیل نہیں دے رہے۔

اسی طرح خلفائے بنواُمیہ اور خلفائے بنوعباس نے بھی مرتد پر سزائے قتل نافذ کی۔

2۔ اجماعِ امت:

ائمہ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے اور اس پر اجماعِ اُمت ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل حوالے ملاحظہ ہوں:

1۔ ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہ کے فقہی مسائل پر مبنی کتاب "الفقه على المذاهب الأربعة" (از عبدالرحمٰن جزیری) میں ہے کہ:

((واتفق الأئمة الأربعة عليهم رحمة الله تعالىٰ على أن من ثبت ارتداده عن الإسلام ـــ والعياذ بالله ـــ وجب قتله ، وأهدر دمه .)) (الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد 5، صفحہ 423)

"ائمہ اربعہ رحمۃ اللہ علیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص اسلام سے پھر جائے ...... اللہ بچائے ...... اُس کا قتل واجب ہے اور اُس کا خون بہانا جائز ہے۔"

2۔ اسلامی فقہ کے اجماعی مسائل پر مشتمل انسائیکلو پیڈیا موسوعۃ الاجماع میں ہے کہ مرتد کا خون بہانا جائز ہے:

((اتفقوا على أن من كان رجلا مسلمًا حرًّا ...... ثم ارتد إلى دين كفر ...... أنه حل دمه .)) (موسوعۃ الاجماع جلد اوّل، ص 436)

"اس پر تمام فقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ آزاد مسلمان مرد مرتد ہو جائے تو اس کا خون بہانا جائز ہے۔"

3۔ اسلامی فقہ کی مشہور کتاب الفقہ الاسلامی و أدلتہ میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی بھی أحکام المرتد کے تحت مرتد کی سزا قتل ہونے پر اجماعِ اُمت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((اتفق العلماء علی وجوب قتل المرتد لقوله ﷺ: "من بدّل دينه فاقتلوه." وقوله علیہ السلام: "لا يحل دم امرئ مسلم إلا بإحدى ثلاث: الثيب الزاني، والنفس بالنفس، والتارك لدينه المفارق للجماعة." وأجمع أهل العلم على وجوب قتل المرتد.))

(الفقہ الاسلامی وادلتہ، جلد 6، صفحہ 186)

"علما کا اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کا قتل واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو مسلمان اپنا دین بدل لے، اسے قتل کردو۔ نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کسی مسلمان شخص کا خون حلال اور مباح نہیں ہوتا مگر تین صورتوں میں: ایک یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی جان کا قاتل ہو اور تیسرے یہ کہ وہ دین کو چھوڑ دے، یعنی مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجائے اور اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مرتد واجب القتل ہے۔"

مذکورہ بالا شرعی دلائل کی تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس پر اجماعِ اُمت ہے۔

مرتد کے لیے سزائے قتل کے عقلی دلائل:

اب تک ہم نے ایسے شرعی دلائل پیش کردیئے ہیں جن سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس کی بنیاد احادیث صحیحہ، تعامل صحابہؓ اور اجماعِ اُمت پر ہے۔ ان شرعی دلائل کو جان لینے کے بعد ایک صاحب ایمان کا دل تو مطمئن ہوجاتا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی یہی سزا ہے۔ مگر کیا کیجیے، آج کل بہت سے اہل ایمان کے دلوں کو کسی شرعی حکم کے بارے میں محض شرعی دلائل سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے علاوہ عقلی دلائل بھی چاہتے ہیں تاکہ اُنھیں شرحِ صدر حاصل ہو۔ اس لیے ہم ذیل میں مرتد کی

سزائے قتل کے بارے میں چند عقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں:

1۔ سب سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح کا کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو انسانی زندگی کا محض ایک جز و یا ضمیمہ بن کر رہے اور جو ہر شخص کا ایک ذاتی اور نجی معاملہ (Private Matter) ہو۔ وہ کوئی لباس بھی نہیں جسے کوئی شخص آج پسند کر کے پہنے اور کل اُسے ناپسند کر کے اپنے جسم سے اُتار پھینکے۔ وہ دراصل ایک دین اور ایک نظامِ زندگی ہے۔ ایک مکمل ضابطہ حیات (Code of Life) ہے۔ وہ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر محیط ایک منظم معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ عبادت، معاشرت، معیشت، سیاست اور اخلاق، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، وہ ایک ایسی منظم و منضبط ریاست (Disciplined State) کی تشکیل کا خواہاں ہے جس کا ہر شہری اس کے جملہ احکام وقوانین کی پابندی کرے اور ان کی خلاف ورزی سے باز رہے۔

اب اگر اسلامی ریاست کا کوئی شہری اس کے کسی قانون کو توڑتا ہے تو وہ اپنے شہری کو اپنے قانون کے مطابق سزا دینے میں حق بجانب ہے۔ جب کوئی مسلمان شہری مرتد ہو جائے گا تو اسلامی ریاست ایسے شخص کو ارتداد (Apostasy) کے جرم کا ارتکاب کرنے پر موت کی سزا دے گی۔ یہ اسلامی ریاست کا قانون ہے اور دنیا کی دوسری ریاستوں کی طرح اسے بھی اپنے قانون کے نفاذ کا اختیار ہے۔

2۔ اسلام نے اپنے دائرے میں داخل نہ ہونے والوں اور اس میں داخل ہو کر نکل جانے والوں میں فرق کیا ہے۔ وہ پہلے گروہ کو ''کفار'' اور دوسرے کو ''مرتدین'' کہتا ہے۔ وہ پہلے گروہ کو برداشت کرتا اور کچھ حقوق بھی دیتا ہے، مگر دوسرے گروہ کو برداشت نہیں کرتا اور اُسے ہر حق سے محروم رکھتا ہے۔ پہلا گروہ بیگانوں کا ہے اور دوسرا بے وفا یگانوں کا۔ اُسے بیگانوں کی بے مروّتی پر کوئی شکوہ نہیں، مگر اپنوں کی بے وفائی اُسے گوارا نہیں۔ وہ بیگانوں سے محتاط رہتا ہے اور اُن کو اپنا رازدان نہیں بناتا۔ اس لیے

بیگانے اُسے زیادہ نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے۔ مگر اپنوں سے اُس کی رازداری ہے جن کے چھوڑ جانے سے اُس کا دل کڑھتا ہے اور اُن کی طرف سے اُسے بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہو جاتا ہے کہ کہیں وہ سازش کر کے اُسے کسی بڑے خطرے سے دوچار نہ کر دیں، کیوں کہ ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے'' ہے۔

مرتد کا معاملہ اسی دوسری قسم سے متعلق ہے، وہ اسلام کا رازداں ہوتا ہے۔ جب وہ ارتداد کا مرتکب ہو کر دین اسلام سے الگ ہوتا ہے تو اپنے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات لیے ہوئے اہل کفر کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ اُس کے یہ منفی جذبات کفار کی طرف سے اسلام اور اسلامی ریاست کے خلاف کسی بڑے خطرے اور سازش کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں، جس کے انسداد کے لیے اسلام نے مرتد کو موت کی سزا سنائی ہے۔

3۔ اسلام نے دنیا کے سامنے سوا چودہ سو برس پیشتر سے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ اس کے دائرے میں داخل ہونے یا نہ ہونے کی ہر شخص کو کھلی آزادی حاصل ہے۔ اس کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔ (البقرۃ: 256) لیکن اس دائرے میں داخل ہونے کے بعد اس سے باہر نکلنے پر پابندی عاید ہے اور جو کوئی اس پابندی کو توڑے گا اُسے موت کے گھاٹ اُتارا جائے گا۔

اب اگر کوئی شخص اسلام کا یہ اعلان سن لینے کے بعد اپنی آزاد مرضی سے اس کے دائرے میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اپنی آزاد مرضی کے ساتھ اس سے باہر نکلنے پر عائد پابندی کو توڑتا ہے اور پھر اپنی اس حرکت پر اپنے کیے کی سزا پاتا ہے تو بتایئے اس میں اسلام کا کیا قصور ہے؟

4۔ ارتداد کو اسلام کے خلاف سازش کا ذریعہ بھی بنایا جا سکتا ہے اور مدینے کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف یہ ہتھیار فی الواقع استعمال کیا تھا، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ:

﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (آل عمران:72)

''اہل کتاب کا ایک گروہ (اپنے لوگوں سے) کہتا ہے: تم جا کر صبح کو اس (دین) پر ایمان لے آؤ جو مسلمانوں پر اُترا ہے اور پھر شام کو انکار کر دو تا کہ اس طرح اور (مسلمان) بھی (اپنے دین سے) پھر جائیں۔''

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ سازش کی تھی کہ اپنے ہاں کے کچھ پڑھے لکھے معتبر لوگوں کو مسلمانوں کی جماعت میں شامل کیا جائے، وہ بظاہر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ پھر جلد ہی اسلام کو چھوڑ کر اس سے بیزاری کا اظہار کریں۔ اس کی ''خرابیاں'' دوسرے لوگوں تک پہنچائیں، اس طرح مسلمانوں بالخصوص نومسلموں کا ایمان متزلزل کیا جا سکے اور وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں کہ جب پڑھے لکھے معقول حضرات بھی اسلام کے قریب جا کر اس سے بدک جاتے ہیں تو ضرور اس دین میں کچھ خرابیاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس طریقے سے عام لوگوں میں اسلام اور اہل اسلام کے لیے کوئی کشش اور ترغیب باقی نہ رہے گی۔ اگرچہ یہودیوں کی یہ سازش بوجوہ ناکام رہی، تاہم آج بھی ارتداد کی کسی سازش کے ذریعے کمزور ایمان والے مسلمانوں کے لیے کسی مقام پر بھی کوئی فتنہ کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

5۔ آج کی مہذب ریاستوں کے عام قانون کی رُو سے کسی شخص کو فوجی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ مگر جب کوئی شخص اپنی مرضی سے فوجی ملازمت اختیار کر لیتا ہے تو اُسے ایک خاص مدت سے پہلے نوکری چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر وہ اپنی مرضی سے وقت سے پہلے نوکری چھوڑ دے تو اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اُس کا کورٹ مارشل کر کے اسے سزا دی جاتی ہے اور اگر وہ مفرور (Deserter) ہو جائے تو اسے سزائے موت کا مستحق بھی قرار دیا جاتا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے اور اس عالمگیر قانون پر اعتراض کیوں نہیں کیا جاتا؟

اس لیے کہ فوج بھیڑوں کا گلہ نہیں ہوتا، وہ ایک منظم ادارہ ہوتا ہے۔ وہ اجتماعی ذمہ داریوں کا ایسا نظام ہے جو نظم وضبط (Descipline) کی سختی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سول (Civil) میں جن کاموں کو بالکل معمولی سمجھ کر ان سے اعراض کیا جاتا ہے،

وہی کام فوج میں جرائم قرار پاتے ہیں۔ وقت پر حجامت نہ بنوانا، اپنے بوٹ پالش نہ کرنا، اُن کے تسمے نہ باندھنا، وقت پر کھانا نہ کھانا، اپنا بستر درست نہ رکھنا، سول (Civil) میں کوئی جرائم نہیں مگر یہی کام فوج میں جرائم شمار ہوتے ہیں۔

بالکل یہی معاملہ اسلامی ریاست کا ہے، وہ بھی کوئی بکریوں کا ریوڑ نہیں ہوتی کہ جس بکری کا جب جی چاہا ریوڑ سے الگ ہوگئی اور جب چاہا اس میں پھر شامل ہوگئی۔ اسلامی ریاست ایک خدائی فوج (حزب اللہ) ہے جس کے نظم وضبط میں عام فوجی نظم وضبط سے بڑھ کر سختی اور پابندی ہے۔ عام فوج کے لیے چوبیس گھنٹوں میں صرف دو دفعہ حاضری ہے، مگر اسلامی معاشرے کے افراد کو پانچ وقت مسجد میں حاضری دینی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست ارتداد کو جرم قرار دیتی اور مرتد کو سخت ترین سزا دیتی ہے تاکہ اس کا اندرونی نظم وضبط قائم رہے۔ وہ ایک مرتد کو سزا دے کر اسی طرح اپنے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے ایمان کا تحفظ کرتی ہے جس طرح کسی قاتل کو سزا دے کر پورے معاشرے کی زندگی کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کے اس نظم وضبط کی سختی پر اعتراض کرنے والوں کو پہلے اپنے ہاں کے فوجی نظم وضبط کی سختی پر غور کر لینا چاہیے۔

- اس مقام پر بعض لوگ (جن میں غامدی صاحب بھی شامل ہیں) یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ جب کوئی مرتد مسلح ہو کر بغاوت کرے تو صرف اسی صورت میں وہ واجب القتل ہوسکتا ہے اور اگر وہ اسلامی ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد اور بغاوت نہ کرے تو اُسے قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

اس اعتراض کا شرعی جواب تو یہ ہے کہ جن احادیث صحیحہ کی بنیاد پر مرتد کے واجب القتل ہونے پر اجماع ہے، اُن احادیث میں یہ بات مذکور نہیں ہے کہ مرتد جب تک مسلح بغاوت نہ کرے، وہ قتل کا مستحق نہیں ہے بلکہ ان احادیث میں مرتد کے محض مرتد ہونے پر اس کے لیے قتل کی سزا کا ذکر آیا ہے۔

اور اس اعتراض کا عقلی جواب یہ ہے کہ جس طرح دنیا بھر میں کسی مفرور فوجی کو محض

مفرور ہو جانے پر فوجی قانون کی رُو سے موت کی سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے اور اسے یہ سزا دینے کے لیے اُس کی طرف سے مسلح بغاوت ہونا کوئی شرط نہیں، بالکل اسی طرح ایک اسلامی ریاست بھی اپنے شرعی قانون کے مطابق مرتد کو، اس کی طرف سے مسلح بغاوت کیے بغیر بھی موت کی سزا دے سکتی ہے۔

مرتد کی سزا کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف کا جائزہ:

غامدی صاحب مرتد کے لیے قتل کی شرعی سزا کو نہیں مانتے۔ اس بارے میں اُن کا موقف یہ ہے کہ مرتد کے لیے قتل کی سزا کا حکم تو ثابت ہے مگر یہ صرف رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے اُن مشرکین عرب کے ساتھ خاص تھا جو اسلام قبول کر لینے کے بعد ارتداد اختیار کرتے تھے، باقی اور کسی قسم کے مرتد کے لیے قتل کی شرعی سزا کا کوئی وجود نہیں۔ غامدی صاحب اپنے اس موقف کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''ارتداد کی سزا کا یہ مسئلہ محض ایک حدیث کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔ یہ حدیث بخاری میں اس طرح نقل ہوئی ہے: ((من بدل دینه فاقتلوه .)) ...... ''جو شخص اپنا دین تبدیل کرے، اسے قتل کر دو۔'' ہمارے فقہا اسے بالعموم ایک حکم عام قرار دیتے ہیں جس کا اطلاق ان کے نزدیک ان سب لوگوں پر ہوتا ہے جو زمانۂ رسالت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر کہیں بھی اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں گے۔ ان کی رائے کے مطابق ہر وہ مسلمان جو اپنی آزادانہ مرضی سے کفر اختیار کرے گا، اسے اس حدیث کی رُو سے لازماً قتل کر دیا جائے گا۔ اس معاملے میں ان کے درمیان اگر کوئی اختلاف ہے تو بس یہ کہ قتل سے پہلے اسے توبہ کی مہلت دی جائے گی یا نہیں اور اگر دی جائے گی تو اس کی مدت کیا ہونی چاہیے؟ فقہائے احناف البتہ، عورت کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی تمام فقہا اس بات پر متفق ہیں کہ ہر مرتد کی سزا خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اسلامی شریعت میں قتل

ہے۔" (برہان، طبع چہارم، جون 2006ء، صفحہ 139)

وہ مزید فرماتے ہیں کہ؛

"لیکن فقہا کی یہ رائے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم تو بیشک ثابت ہے مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی حکم عام نہ تھا بلکہ صرف انہی لوگوں کے ساتھ خاص تھا، جن میں آپ کی بعثت ہوئی اور جن کے لیے قرآنِ مجید میں اُمِّیّٖنَ یامُشْرِکِیْنَ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔"

(برہان، طبع چہارم، صفحہ 140، جون 2006ء)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ؛

"ہمارے فقہا کی غلطی یہ ہے کہ اُنھوں نے قرآن وسنت کے باہمی ربط سے اس حدیث کا مدعا سمجھنے کے بجائے اسے عام ٹھہرا کر ہر مرتد کی سزا موت قرار دی اور اس طرح اسلام کے حدود و تعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کر دیا، جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں ہے۔"

(برہان، صفحہ 143، طبع چہارم، جون 2006ء)

ارتداد کی سزا کے بارے میں غامدی صاحب کے اس موقف کا جائزہ لیا جائے تو ان کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ؛

1۔ فقہائے اسلام نے صحیح بخاری کی حدیث ((من بدل دینه فاقتلوه .)) ......"جو مسلمان اپنا دین بدل لے تو اُسے قتل کردو۔" کو غلطی سے ایک عام حکم سمجھا ہے، جبکہ یہ ایک خاص حکم ہے۔

2۔ فقہائے اسلام نے مذکورہ بالا ایک ہی حدیث کی بنا پر ہر قسم کے مرتد کے لیے قتل کی سزا بیان کردی ہے۔

3۔ مذکورہ حدیث کی اصل قرآنِ مجید کی ایک آیت سورۃ التوبہ: 5 ہے، جس کے بعد اس

حدیث کا حکم خاص ہو جاتا ہے۔

4۔ اسلام کے حدود و تعزیرات میں مرتد کے لیے قتل کی سزا کا کوئی وجود نہیں۔

اب غامدی صاحب کے اس موقف کا ہم تجزیہ کرتے ہیں۔

(1) کیا مذکورہ حدیث کا حکم عام نہیں؟

غامدی صاحب مذکورہ حدیث کے حکم کو عام نہیں مانتے جب کہ عربیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسے عام مانا جائے۔ اس حدیث: ((من بدل دينه فاقتلوه.)) ...... "جو مسلمان اپنا دین بدل لے تو اُسے قتل کر دو۔" میں مَنْ موصولہ کا اُسلوب وہی ہے جو درج ذیل حدیث کا ہے:

((مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا.)) (جامع ترمذی، حدیث: 1315)

"جس نے دھوکہ دیا، وہ ہم میں سے نہیں۔"

اس حدیث میں بھی مَنْ (جو، جو کوئی، جس نے) موصولہ آیا ہے۔ اور اس کا حکم عام ہے۔ اس سے ہر دھوکہ دینے والا شخص مراد ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے دھوکہ دینے والا کوئی خاص فرد مراد ہے۔ عرب کے دھوکے باز مراد ہیں، اور عجم کے دھوکے باز مراد نہیں ہو سکتے۔

غامدی صاحب نے حدیث: ((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ.)) میں مَنْ موصولہ کو اس کے عام حکم معنوں میں لینے کی بجائے "مشرکین عرب" کے خاص معنوں میں لیا ہے جو کہ عربیت کے بالکل خلاف ہے اور قرآن و حدیث کا جو مفہوم بھی عربیت کے خلاف لیا جائے، وہ غلط ہے کیونکہ یہ قرآن و حدیث کی معنوی تحریف ہے جو قرآن و حدیث کے انکار کے مترادف ہے اور اس حربے سے سارے دین کو دورِ نبوی ﷺ تک محدود کر کے پوری شریعت اسلامیہ کا تیا پانچا کیا جا سکتا ہے اور یہ کارنامہ ہمارے زمانے کے منکرین حدیث، بالخصوص غامدی صاحب بڑی دیدہ دلیری سے سرانجام دے رہے ہیں۔ ؏

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

⊙ البتہ اس مقام پر عربیت کی رُو سے ایک سوال یہ اُٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا اس مَـــنْ (جو)

میں کافر بھی شامل ہے تو اس سوال کے جواب کی وضاحت خود نبی ﷺ نے اپنی دوسری احادیث میں فرمادی ہے کہ اس سے مسلمان مراد ہے۔ مثال کے طور پر ایک متفق علیہ حدیث ہے، جو پیچھے گزر چکی ہے:

((عن عبداللّٰه قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: "لا یحل دم امرئ مسلم یشهد أن لا إلٰه الا اللّٰه، وأنّي رسول اللّٰه إلا بإحدیٰ ثلاث: النفس بالنفس، والثیب الزاني، والمفارق لدینه التارك للجماعة .)) (صحیح بخاری، رقم:2878)

"سیّدنا عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، سوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، دوسری یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو اور تیسری یہ کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جائے۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کے مرتد ہو جانے پر اُس کے لیے قتل کی سزا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ مسلمان ہونے سے پہلے عرب کا مشرک تھا یا عجم کا کافر تھا۔ دونوں صورتوں میں ایک ہی سزا ہے۔

(2) کیا مرتد کی سزا کا مبنیٰ صرف ایک ہی حدیث ہے؟

غامدی صاحب کا کہنا ہے کہ فقہائے اسلام نے صرف صحیح بخاری کی ایک حدیث: ((مَنْ بَدَّلَ دِیْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ .)) کی بنیاد پر مرتد کے لیے قتل کی سزا بیان کردی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ علمی خیانت پر مبنی ہے اور وہ یہ بات عام لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے فرمارہے ہیں۔ فقہائے اسلام کے اس اجماعی فیصلے کی بنیاد صرف ایک حدیث پر نہیں بلکہ متعدد احادیث صحیحہ پر ہے جن کو ہم اس مضمون کے شروع میں بیان کرچکے ہیں۔

غامدی صاحب کا یہ "طریق واردات" کہ کسی مسئلے پر بحث و استدلال کے لیے اس

سے متعلق تمام احادیث کو پیشِ نظر رکھنے کی بجائے بعض حدیثوں کو لے لینا اور بعض کو چھوڑ دینا معروف دیانت دارانہ طریق بحث و استدلال نہیں ہے بلکہ یہ کام اُن کے لیے اپنے مسلمہ اُصول کے بھی خلاف ہے۔ وہ خود مانتے ہیں کہ؛

''چوتھی چیز یہ ہے کہ کسی حدیث کا مدعا متعین کرتے وقت اس بات کی تمام روایات پیشِ نظر رکھی جائیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی حدیث کا ایک مفہوم سمجھتا ہے لیکن اسی باب کی تمام روایات کا مطالعہ کیا جائے تو وہ مفہوم بالکل دوسری صورت میں نمایاں ہوجاتا ہے۔''

(میزان، صفحہ 64-65 طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی، صفحہ 72، طبع دوم فروری 2005ء)

مگر مرتد کی سزا کے معاملے میں اور شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد کے بارے میں غامدی صاحب نے اپنے اس اصول کا بھی خون کردیا ہے۔ انھوں نے اس بارے میں صرف ایک ہی حدیث کی بنا پر ایک غلط رائے قائم کرلی ہے اور باقی متعلقہ روایات سے چشم پوشی کرلی ہے۔

(3) مذکورہ حدیث کا قرآن سے ربط:

غامدی صاحب کہتے ہیں کہ فقہائے اسلام نے حدیث ((مَنْ بَدَّلَ دِیْنَہٗ فَاقْتُلُوْہُ.)) ...... ''جو مسلمان اپنا دین بدل لے، تو اُسے قتل کردو'' کو قرآن کی اصل سے متعلق نہیں کیا اور قرآن وسنت کے باہمی ربط سے اس حدیث کا مدعا اور مطلب سمجھنے کی کوشش نہیں کی جس کے نتیجے میں اُنھوں نے مرتد کے لیے ایک ایسی سزا (قتل) قرار دے دی جس کا اسلامی حدود وتعزیرات میں کوئی وجود نہ تھا۔ اس کے بعد اُنھوں نے اس حدیث کا ربط قرآنِ مجید کی سورۃ التوبہ کی اس آیت 5 سے جوڑا ہے، جسے ہم اُن کے اپنے ترجمے کے ساتھ یہاں درج کرتے ہیں:

﴿فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ (التوبہ: 5)

''پھر جب حرام مہینے گزر جائیں تو ان مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور اس کے لیے ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور ہر گھات میں ان کے لیے تاک لگاؤ، لیکن اگر وہ کفر و شرک سے توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کرنے لگیں تو اُنھیں چھوڑ دو۔ بے شک اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

آخر مرتد کے بارے میں مذکورہ حدیث اور اس قرآنی آیت میں کیا ربط و اشتراک ہوسکتا ہے؟ اسے ہر وہ شخص جان سکتا ہے جس نے زندگی میں کبھی ایک مرتبہ بھی قرآنِ مجید کو کھلے ذہن کے ساتھ سمجھ کر پڑھا ہو۔ قرآنِ مجید کی اس آیت کو جیسا کہ اس کے مضمون سے ظاہر ہے، مفسرین حضرات نے مشرکین کے خلاف جہاد و قتال سے متعلق قرار دیا ہے، جب کہ مذکورہ حدیث مرتد کے بارے میں حکم بیان کرتی ہے۔ اب ارتداد کی سزا اور جہاد و قتال کے درمیان کیا باہمی ربط ہے؟ اس عقدے کی گرہ کشائی صرف غامدی صاحب کی عقل و منطق ہی کرسکتی ہے جو قرآن و حدیث کی عبارات میں اپنے خیالات پڑھنے کی عادی ہوچکی ہے۔ علمی دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ مرتد کے بارے میں آمدہ حدیث کو قرآنِ مجید کی اُن آیات سے جوڑا جاتا جن میں ارتداد اور مرتدین کا ذکر آیا ہے مگر ایسا دانستہ طور پر نہیں کیا گیا، کیونکہ ؏

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

قرآنِ مجید میں ارتداد اور مرتد کا ذکر درج ذیل مقامات پر موجود ہے اور جن کو مولانا اصلاحی صاحب نے بھی اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں بیان کیا ہے۔ سورۃ البقرہ کی

آیت: 217 اور سورۃ المائدۃ کی آیت: 54۔ اپنی بات کی وضاحت کے لیے اس جگہ ہم ان میں سے صرف ایک ہی حوالے پر اکتفا کرتے ہیں:

﴿وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

(البقرۃ:217)

''اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت ہی میں مرے گا تو اس کے سارے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔''

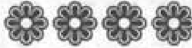
قرآنِ مجید کا یہ مقام اور دوسرے مذکورہ مقامات ایسے ہیں جن کو ارتداد اور مرتدین کے حوالے سے اُن احادیث سے جوڑا جا سکتا ہے جن میں مرتد کے بارے میں کوئی حکم آیا ہے اور غامدی صاحب کے استاد، مولانا اصلاحی صاحب نے بھی اپنی تفسیر ''تدبرِ قرآن'' میں ان قرآنی مقامات کی وضاحت میں ارتداد اور مرتدین کا ذکر کیا ہے مگر اُنہوں نے سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 5 میں مرتدین کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، جسے غامدی صاحب خواہ مخواہ مرتد سے متعلق حدیث کے ساتھ جوڑ رہے ہیں۔

(4) کیا مرتد کے لیے قتل اسلامی سزا نہیں؟

غامدی صاحب کے موقف کا آخری نکتہ یہ ہے کہ اسلام کے حدود و تعزیرات میں مرتد کے لیے سزا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ تمام فقہائے اسلام کی مشترکہ اور متفقہ غلطی ہے کہ اُنہوں نے اسے اسلامی حدود و تعزیرات میں شامل کر رکھا ہے۔

ہم نے گزشتہ صفحات میں مرتد کے لیے سزائے قتل کو احادیث صحیحہ کے نصوص، تعاملِ صحابہؓ، ائمہ مجتہدینؒ اور تمام فقہائے اسلام کے اجماع سے ثابت کیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اسلام کے حدود و تعزیرات میں مرتد کے لیے قتل کی سزا کا کوئی وجود نہیں ہے تو وہ اسلامی شریعت، حدیث و سنت اور اجماعِ اُمت کا منکر ہے اور ایسا شخص یقیناً گمراہ ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ سلف سے خلف تک عرب و عجم کے تمام مجتہدین اور فقہائے اسلام عربیت سے نا آشنا، قرآن و حدیث کو سمجھنے سے عاری اور شریعت کے احکام سے ناواقف تھے کہ سب نے مل کر یہ غلطی کر ڈالی کہ مرتد کے لیے سزائے قتل قرار دے دی اور اسلام میں اپنی طرف سے بدعت کے طور پر ایک ایسی شرعی حد داخل کر دی جس کا اسلامی حدود و تعزیرات میں کوئی وجود نہ تھا؟ ایسی بات کہنے کی جسارت صرف وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دماغ درست نہ ہو، جس کے دل میں ذرا بھی خوفِ خدا نہ ہو اور جسے آخرت کا ڈر نہ ہو۔



باب نمبر 9:

کیا شادی شدہ زانی کیلئے رجم (سنگساری) کی حد (سزا) نہیں؟

غامدی صاحب نے شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد کا بھی انکار کیا ہے۔حالاں کہ یہ شرعی حد سنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

اس سلسلے میں غامدی صاحب اپنا موقف اس طرح بیان کرتے ہیں:

1۔ ''کوئی زانی کنوارا ہو یا شادی شدہ، دونوں کی اصل سزا تو جلد (تازیانہ) ہی ہے۔''

(میزان، حصہ اوّل، صفحہ 183، طبع مئی 1985ء، لاہور)

2۔ ''تعجب ہوتا ہے کہ یہ اصحابِ عقل و بصیرت آخر کس طرح فرض کر لیتے ہیں کہ قرآن میں تو لامحالہ کنوارے زانیوں ہی کی سزا بیان ہوئی ہے، رہے شادی شدہ زانی تو اُن کی سزا چونکہ عقل و حکمت اور عدل و انصاف کی رو سے زیادہ ہونی چاہیے۔اس لیے قرآن سے نہ بھی ملے تو کسی اور جگہ سے تلاش کر کے وہ ان پر نافذ کر دینی چاہیے۔''

(میزان حصہ اوّل، صفحہ 168، طبع مئی 1985ء)

3۔ ''لغت عرب سے واقف کوئی شخص اس بات کا تصور نہیں کر سکتا کہ "اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ" کے الفاظ سے محض کنوارا زانی اور کنواری زانیہ بھی مراد لیے جا سکتے ہیں۔''

(میزان حصہ اوّل، ص 135، طبع مئی 1985ء)

4۔ ''موت کی سزا قرآن کی رو سے قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی جرم میں بھی نہیں دی جا سکتی۔''

(میزان ص 283، طبع دوم، اپریل 2002ء، لاہور)

(میزان ص 611، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

5۔ ”زانی مرد ہو یا عورت، اُس کا جرم اگر ثابت ہو جائے تو اس کی پاداش میں اُسے سو کوڑے مارے جائیں گے۔“ (میزان، ص624، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

اب ہم غامدی صاحب کے اس موقف کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

قرآن میں جرمِ زنا کی سزا:

قرآن حکیم نے زنا کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے آغاز میں یہ سزا بیان کی تھی کہ اگر چار گواہ اس امر کی شہادت دے دیں کہ انہوں نے کسی مرد اور عورت کو زنا کرتے دیکھا ہے تو ان دونوں کو مارا پیٹا جائے اور زانیہ عورت کو گھر میں قید کر دیا جائے۔ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ○ وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ○﴾ (النساء:15:16)

”اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں تو ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی طلب کرو۔ اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند رکھو، یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کر دے یا کسی موقع پر ان کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی راستہ نکال دے، اور اگر تم میں سے مرد اسی جرم کا ارتکاب کریں تو ان کو ایذا دو۔ پھر اگر وہ توبہ اور اصلاح کر لیں تو ان کو چھوڑ دو۔ بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔“

جرمِ زنا کی مذکورہ بالا سزا قرآن مجید کا ایک ابتدائی اور عارضی نوعیت کا حکم تھا جس کی طرف ” اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا“ (ان کے لیے اللہ کوئی راستہ نکال دے گا) کے الفاظ اشارہ کر رہے ہیں۔

اس کے بعد سورۂ نور کی آیت 2 میں اس سلسلے کا مستقل حکم نازل ہوا:

﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْیَشْهَدْ

عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ○﴾ (النور:2)

''زانیہ عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور اللہ کے قانون کے معاملے میں قطعاً کوئی نرمی اختیار نہ کرو، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور ضروری ہے کہ ان کو سزا دیتے وقت مسلمانوں کا ایک گروہ موجود رہے۔''

اس آیت کے نزول کے بعد سورۂ نساء کے مذکورہ بالا احکام منسوخ ہو گئے۔ اب آئندہ کے لیے جرمِ زنا کی سزا سو کوڑے مقرر ہو گئی۔

مگر آیت جلد کا یہ حکم درحقیقت کوئی حکم عام نہ تھا جسے غلطی سے غامدی صاحب نے عام حکم سمجھ رکھا ہے کہ اس میں ہر قسم کا مرتکب زنا شامل ہو، کیونکہ قرآن حکیم نے زانیہ لونڈیوں (اور ان کے ساتھ غلاموں) پر اس حکم کا اطلاق نہیں کیا، بلکہ ان کی تخصیص کرتے ہوئے فرمایا:

﴿فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنَاتِ مِنَ الْعَذَابِ ط﴾ (النساء:25)

''جب وہ لونڈیاں قید نکاح میں آ جائیں اور پھر اگر وہ کوئی بدکاری کریں تو ان کے لیے اس سزا کا نصف ہے جو '' محصنات ''(آزاد عورتوں) کے لیے مقرر ہے۔''

واضح رہے کہ یہاں پر'' العذاب '' کی جو سزا بیان ہوئی ہے یہ وہی سزا ہے۔ جسے آیت جلد میں عَذَابَهُمَا کہا گیا ہے، اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے۔

اس طرح قرآن مجید نے قیدِ نکاح میں آئی ہوئی لونڈیوں (اور ان کے ساتھ غلاموں) کے لیے ارتکابِ زنا کی صورت میں نصف سزا یعنی پچاس کوڑوں کی سزا مقرر کی ہے۔ [1]

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ سورۂ النور کی آیت جلد (2) کا حکم کوئی عام حکم نہیں ہے بلکہ

---

[1] غامدی صاحب کی ''علمی دیانت'' کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی کتاب میزان (ص 481، طبع مئی ۲۰۰۸ء لاہور) میں مذکورہ آیت (النساء:25) درج کرتے وقت بدنیتی سے اس کے بیچ کا وہ ٹکڑا غائب کر دیا ہے جس میں لونڈیوں کے جرمِ زنا پر آدھی سزا بیان ہوئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ شخص قرآن مجید کی من مانی تاویلات کے علاوہ اس کی معنوی تحریف سے بھی باز نہیں آتا۔ (مصنف)

اس کا حکم صرف آزاد زانیوں کے لیے خاص ہے اور جو لوگ اسے عام حکم سمجھ کر اس سے زنا کے ہر مجرم کی سزا سو(100) کوڑے قرار دیتے ہیں ان کی رائے قرآن مجید کے خلاف ہے۔

پھر سنت نے ان آزاد زانیوں کی مزید وضاحت کر دی ہے کہ ان میں سے بھی صرف غیر شادی زانی مراد ہیں۔ رہے شادی شدہ آزاد زانی تو ان کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد (مقررہ سزا) ہے۔

سنت اور سزائے رجم:

اب ہم تفصیل کے ساتھ ان احادیث صحیحہ کا ذکر کریں گے جن سے واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شادی شدہ آزاد زانیوں پر سو کوڑوں کی بجائے رجم کی سزا نافذ کی۔ اس سلسلے میں ہم پہلے قولِ رسول اور اس کے بعد فعلِ رسول بیان کرتے ہیں:

ا: قولِ رسول اللہ ﷺ!

1۔ ((عن عائشه رضی اللہ عنہا ، قالت قال رسول الله ﷺ: " لا يحل دم امرئ مسلم يشهد ان لا اله الا الله وان محمد رسول الله ، الا باحدى ثلاث: رجل زنى بعد احصان فانه يرجم ورجل خرج محاربا بالله ورسوله فانه يقتل اويصلب اوينفى من الارض ، اويقتل نفسا فيقتل بها .))

(ابوداؤد، کتاب الحدود، حدیث:4353)

"سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "کسی مسلمان کا خون مباح نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں مگر تین صورتوں میں اس کا خون مباح ہو جاتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وہ شادی کے بعد زنا کا ارتکاب کرے، اس جرم پر اسے سنگسار کیا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرے تو (اس جرم کی پاداش

میں) اسے قتل کیا جائے گا یا اسے پھانسی دی جائے گی یا اسے جلاوطن کر دیا جائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ وہ کسی دوسرے شخص کو قتل کر دے تو اس پر اسے بھی (قصاص کے طور پر) قتل کر دیا جائے گا۔"

2- ((عَنْ عبدالله رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ لا يحل دم امرئ مسلم يشهد ان لا اله الا الله واني رسول الله، الا باحدى ثلاث: النفس بالنفس والثيب الزاني، والمارقِ من الدين التارك الجماعة.))

(صحیح بخاری، کتاب الدیات، حدیث:6878)

"سیدنا عبداللہ (ابن مسعود رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "کسی مسلمان کا خون مباح نہیں جب کہ وہ یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں مگر تین حالتوں میں اس کا خون مباح ہوگا۔ پہلی یہ کہ قصاص کی حالت میں، دوسری یہ کہ شادی شدہ زانی ہونے کی صورت میں اور تیسری یہ کہ دین کو چھوڑنے اور جماعتِ مسلمین سے الگ ہونے کی شکل میں۔"

3- ((عن ابی امامة بن سهل: قال: كنا مع عثمان وهو محصور في الدار، وكان في الدار مدخل من دخله سمع كلام من على البلاط فدخله عثمان، فخرج الينا وهو متغير لونه فقال: انهم ليتوا عدُوننى بالقتل اٰنفاً قال: قلنا يكفيكهم الله يا امير المؤمنين .... قال ولم يقتلوننى؟))

((سمعت رسول الله ﷺ يقول: " لا يحل دم امرئ مسلم الا باحدى ثلاث: كفر بعد اسلام او زنا بعد احصان، او قتل نفس بغير نفس، فوالله ما زنيت في جاهلية ولا في اسلام قط، ولا

احببت ان لی بدینی بدلا مُنذ ھدانی اللہ و لا قتلت نفساً، فبِمَ یقتلوننی؟ .)) (سنن ابی داود، کتاب الدیات، حدیث: 4502)

''سیّدنا ابو امامہ بن سہل کہتے ہیں کہ میں اور دوسرے لوگ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے اور اس گھر کا ایک راستہ تھا جس کے اندر کھڑا آدمی گھر کی بالکونی پر کھڑے لوگوں کی بات آسانی سن سکتا تھا۔ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لائے، ان کے چہرے کا رنگ متغیر تھا، وہ باہر نکلے اور فرمایا: ''ابھی یہ لوگ مجھے قتل کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔'' ہم نے عرض کیا: ''اے امیر المؤمنین! ان کے مقابل میں اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ہے۔ ''فرمایا: ''یہ لوگ کیوں میرے قتل کے درپے ہیں۔''

''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ''کسی مسلمان کا خون حلال نہیں سوائے اس کے کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت واقع ہو، وہ اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کر لے، یا شادی کے بعد زنا کا ارتکاب کرے، یا کسی کو ناحق قتل کر دے۔ خدا کی قسم! میں نہ تو جاہلیت میں زنا کا مرتکب ہوا اور نہ اسلام لانے کے بعد۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنا دین بدلنا بھی پسند نہیں کیا جب سے مجھے اللہ نے ہدایت کی توفیق دی ہے۔ تیسرے یہ کہ میں نے کسی کو ناحق قتل بھی نہیں کیا، پھر یہ لوگ مجھے کس بنا پر قتل کرنا چاہتے ہیں؟''

ان تینوں قولی احادیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ از روئے سنت شادی شدہ کے لیے کوڑوں کی بجائے قتل بصورتِ رجم کی سزا مقرر ہے۔

ب: فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

4۔ ((عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال اتی رجل رسول اللہ ﷺ وھو فی المسجد فناداہ فقال یا رسول اللہ ﷺ! انی زنیت، فاعرض عنہ حتی ردّد علیہ اربع مرات ، فلما شھد علی نفسہ اربع

شهادات۔ دعاه النبی ﷺ فقال: " أبك جنون؟ " قال: " لا " قال: " فهل احصنت؟ " قال: " نعم " فقال النبی ﷺ: " اذهبوا به فارجموه.)) (صحیح بخاری، حدیث: 6815)

”سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت مسجد میں تشریف فرما تھے۔ اس آدمی نے آپ ﷺ کو آواز دی اور کہا: ”اے اللہ کے رسول! میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔“ آپ ﷺ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ اس آدمی نے آپ کو چار مرتبہ متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر جب اس نے چار دفعہ قسم کھا کر اپنے جرم کا اقرار کر لیا تو نبی ﷺ نے اسے بلا کر پوچھا: ”کیا تو پاگل ہے؟ وہ بولا: ”نہیں۔“ آپ نے پوچھا: ”کیا تو شادی شدہ ہے؟ وہ بولا ”جی ہاں۔“ اس کے بعد نبی ﷺ نے حکم دیا ”لوگو! اسے لے جا کر سنگسار کر دو۔“

5- ((عن جابربن عبدالله الانصاری أن رجلا من اسلم اتی رسول الله ﷺ فحدثه انه قد زنی، فشهد علی نفسه اربع شهادات، فامر به رسول الله ﷺ فرجم وكان قد أُحصِنَ .))

(صحیح بخاری، حدیث: 6814)

”حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ قبیلہ اسلم کا ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور کہنے لگا کہ اس نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ پھر اس نے چار دفعہ قسم کھاتے ہوئے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے اسے رجم کئے جانے کا حکم دیا اور پھر اسے رجم کیا گیا اور وہ شخص شادی شدہ تھا۔“

6- ((عن ابی هریرة انه قال اتی رجل من المسلمین رسول الله ﷺ وهو فی المسجد فناداه فقال یا رسول الله! انی زنیت فاعرض

عنـه فتـنـحیٰ تلقاء وجهه ، فقال له یا رسول الله! انی زنیت۔ فـاعـرض عنه حتیٰ ثنیٰ ذٰلك علیه اربع مرات۔ فلما شهد علی نـفسـه اربع شهاداتٍ دعاه رسول الله ﷺ فـقال: أبك جنون؟ قـال: " لا " قـال: فهـل اَحْـصَنْتَ؟ قَالَ: نعم ، فقال رسول الله ﷺ: اِذهبوا بهٖ فارجُموهُ .)) (صحیح مسلم،حدیث:4420)

"سیّدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مسلمان رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ اس وقت مسجد میں تھے۔ اس شخص نے آواز دی اور کہا: اے اللہ کے رسول! میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں۔" رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے دوبارہ کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں۔" آپ پھر بھی متوجہ نہ ہوئے یہاں تک کہ اس نے چار دفعہ اپنی بات دہرائی۔ پھر جب اس نے چار مرتبہ قسم کھا کر اپنے جرم کا اقرار کیا تو رسول اللہ ﷺ نے اسے بلا کر پوچھا: "تو پاگل تو نہیں؟" بولا: "نہیں" پھر آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا تو شادی شدہ ہے؟" وہ بولا: "جی ہاں" (میں شادی شدہ ہوں) اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ اسے لے جا کر سنگسار کر دو۔"

7۔ ((عـن ابـی هریرة و زید ابن خالد الجُهْنی انهما قالا ان رجلا مـن الاعراب اتی رسول الله ﷺ فـقال انشدك الله الا قضیت لـی بـکتـاب الـلـه ، فقال الخصم الأخر وهو افقه منه ، نعم ، فـاقـض بیـننا بکتاب الله وائذن لی . فقال رسول الله ﷺ قل! قـال ان ابنی کان عسیفا علی هذا فزنی بامراته وانی اخبرت ان عـلی ابنی الرجم فافتدیت منه بمائة شاة وولیدة ، فسالت اهل الـعـلـم فاخبرونی انما علی ابنی جلد ماء ة وتـغریب عام وان عـلـی امـرء ة هذا الرجم ، فقال رسول الله ﷺ والذی نفسی

بیده لا قضینّ بینکما بکتاب الله، الولیدة والغنم رد وعلی ابنك جلد ماء ة وتغریب عام، واغدُ یاأُنیس الی امرء ة هٰذا، فان اعترفت، فارجمها قال فغدا علیها فاعترفت فامربها رسول الله ﷺ فرجمت .)) (صحیح مسلم، کتاب الحدود، حدیث:4435)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور زید بن خالد جہنی دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک اعرابی آیا اور آ کر کہنے لگا: اے اللہ کے رسولؐ! میں آپ کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ خدا کی کتاب کے مطابق میرا فیصلہ فرما دیں، اور دوسرا شخص جو پہلے سے زیادہ سمجھ دار تھا کہنے لگا: ''مجھے اجازت دیجئے کہ میں اصل واقعہ بیان کروں۔'' آپ نے فرمایا: ''بیان کرو۔'' وہ بولا: ''میرا لڑکا اس شخص کے ہاں مزدور تھا اور وہ اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہوا۔ مجھے بتایا گیا کہ میرے لڑکے پر رجم کی سزا واجب ہے تو میں نے اس کے فدیے کے طور پر اس آدمی کو ایک سو بکریاں اور ایک لونڈی دی ہے، پھر جب میں نے اہل علم لوگوں سے مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ میرے لڑکے پر سو کوڑوں کی سزا واجب ہے اور اس کے ساتھ ایک سال کی جلا وطنی اور عورت پر رجم کی سزا واجب ہے۔'' یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں تمہارے درمیان کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ لونڈیاں اور بکریاں واپس کر دی جائیں۔ تمہارے لڑکے پر سو کوڑوں کی سزا واجب ہے اور ایک سال کے لیے جلا وطنی اور اے اُنیس [ایک انصاری صحابی کا نام ہے] اس عورت کے ہاں جاؤ اگر وہ اپنے جرم کا اعتراف کر لے تو اسے رجم کر دینا، پھر جب وہ (صحابی) اس عورت کے ہاں گئے تو اس نے اعترافِ جرم کر لیا اور پھر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے اسے رجم کیا گیا۔''

8- ((عن جابر بن عبدالله رضی اللہ عنہ ان رجلا من اسلم جاء الی رسول

اللہ ﷺ فاعترف بالزنا فاعرض عنه، ثم اعترف عنه، حتى شهد على نفسه اربع شهادات، فقال له النبي ﷺ: "أبك جنون؟" قال: "لا" قال: "احصنت؟" قال: "نعم" قال: فأمر به النبي ﷺ فرجم في المصلى، فلما اذلقته الحجارة، فر، فادرك، فرجم حتى مات۔)) (سنن ابی داوٗد، کتاب الحدود، حدیث:4430)

''سیّدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قبیلۂ اسلم کا ایک آدمی رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے آپ کے سامنے جرمِ زنا کا اعتراف کیا، آپ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا، اس نے پھر اقرار کیا، اور جب چار دفعہ قسم کھا چکا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے پوچھا: ''کیا تو پاگل ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''نہیں'' آپ نے پوچھا: ''کیا تو شادی شدہ ہے؟'' وہ بولا: ''جی ہاں'' پھر نبی ﷺ نے اسے رجم کرنے کا حکم دیا۔ لوگ اسے عیدگاہ کی طرف لے گئے اور رجم کرنے لگے۔ جب اس پر پتھر پڑے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ لوگوں نے تعاقب کر کے اسے پھر جا لیا اور سنگسار کر دیا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔''

ان تمام فعلی احادیث کی روشنی میں یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ سنت نے شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا مقرر کی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے مقدماتِ زنا میں ملزم کے عاقل ہونے کے ساتھ ان کی حالتِ احصان (شادی شدہ ہونے) کو بھی منجملہ ان شرائط کے پیشِ نظر رکھا ہے جن کی تحقیق کے بعد آپ نے حدِ رجم کا نفاذ فرمایا ہے۔ دورِ رسالت کے درجن بھر مقدماتِ زنا میں سے کسی ایک مقدمۂ زنا کی روداد میں بھی یہ بات نہیں ملتی کہ:

1۔ آپ ﷺ نے ملزم کی ''غنڈہ گردی بدمعاشی یا اوباشی'' کا اثبات فرمانے کے بعد اس پر رجم کی سزا نافذ کی ہو۔

2۔ نہ ایسی کوئی حدیث ملتی ہے جس میں آپ نے کسی کنوارے زانی کو اس کے ''غنڈہ، بدمعاش یا اوباش'' ہونے کی بنا پر رجم کی سزا دی ہو۔

3۔ کوئی ایک حدیث بھی اس بات کے ثبوت میں پیش نہیں کی جا سکتی جس میں رسول اللہ ﷺ نے کسی شادی شدہ زانی کو رجم کی بجائے صرف سو کوڑوں کی سزا دی ہو۔ میں غامدی صاحب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ ان میں سے کسی ایک کے حق میں کوئی حدیث پیش کر دیں جس سے ان کے موقف کی تائید ہوتی ہو۔ لہٰذا یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ شادی شدہ زانی کے لیے رجم کی سزا سنت کی نص سے ثابت ہے۔

اجماعِ امت اور سزائے رجم:

اس بات پر تمام اہل علم، مفسرین اور فقہائے اسلام کا اجماع ہے کہ سنت کی رُو سے ہر شادی شدہ زانی پر حدِ رجم واجب ہے اور قرآن مجید میں زنا کے جرم پر جو سو (100) کوڑوں کی سزا بیان ہوئی ہے وہ غیر شادی شدہ زانیوں کے لیے سزا ہے۔

1۔ ائمہ مجتہدین کی متفقہ رائے:

کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعہ میں ائمہ اربعہ کی متفقہ رائے اس بارے میں یہ بیان ہوئی ہے:

((اتفق الائمة على ان من كملت فيه شروط الاحصان ثم زنا بامرءة قد كملت فيها شروط الاحصان بان كانت حرة بالغة عاقلة مدخولا بها في نكاح صحيح وهي مسلمة۔ فهما زانيان محصنان يجب على كل واحد منها الرجم حتى يموت .))

(کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ از عبدالرحمٰن جزیری، جلد پنجم، کتاب الحدود)

"ائمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جس شخص میں احصان کی سب شرطیں پائی جائیں اور پھر وہ کسی ایسی عورت سے زنا کا مرتکب ہو جس میں بھی احصان کی تمام شرائط موجود ہوں یعنی وہ آزاد بالغہ عاقلہ ہو اور نکاحِ صحیح کے بعد مدخولہ ہو چکی ہو اور مسلمان بھی ہو۔ تو ایسے شادی شدہ زانی اور شادی شدہ زانیہ میں سے ہر ایک کو

رجم کرنا واجب ہے۔"

2۔ بدایۃ المجتہد میں ہے کہ:

((فإن الثيب الاحرار المحصنون فان المسلمين اجمعوا على ان حدهم الرجم .)) (ابن رشد، بدایۃ المجتہد ج2، ص426)

"رہے آزاد شادی شدہ زانی تو اس بارے میں مسلمانوں کا اجماع ہے کہ ان کے لیے رجم کی حد واجب ہے۔"

3۔ مشہور محدث وفقیہ امام نووی رحمہ اللہ شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

((اجمع العلماء وجوب جلد الزانی البكر مائة ورجم المحصن وهو الثيب .))

"علمائے امت کا اس پر اجماع ہے کہ کنوارے زانی پر سو کوڑے اور شادی شدہ زانی پر حدِ رجم واجب ہے۔" (شرح صحیح مسلم از امام نوویؒ، جلد دوم)

4۔ اسلامی فقہ کی مشہور ومعتبر کتاب 'الفقه الاسلامی وادلته' میں الدکتور وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

((اتفق العلماء على أن حد الزانی المحصَن هو الرجم...... بدليل ما ثبت فی السنة المتواترة واجماع الامة، والمعقول .)) (الفقہ الاسلامی وادلتہ، ج6، ص40)

"علمائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی حد ہے...... جو سنت متواترہ، اجماع امت اور عقل وحکمت سے ثابت ہے۔"

5۔ امت کے اجماعی مسائل کی مشہور کتاب "موسوعة الاجماع فی الفقه الاسلامی" میں ہے کہ:

((ان المسلمين اجمعوا على أن الزانی المحصَن، اذا زنى عامدًا، عالمًا، مختارًا، فحدُّه الرَّجْمُ حتى يموت...... وقد

اتفقوا علی اَنّ الاحصان شرط للرجم .))

(موسوعۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی، ج 1، ص 322 طبع دمشق)

''مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جب کوئی شادی شدہ شخص جان بوجھ کر دانستہ اپنی مرضی سے زنا کرے تو اس کی حد (سزا) رجم یعنی سنگساری ہے یہاں تک کہ وہ مرجائے۔''

بائبل کا حوالہ:

زنا چونکہ کئی جرائم کا مجموعہ بلکہ ام الجرائم ہے۔ اس لیے تمام الہامی مذاہب میں زنا کو گناہ اور جرم قرار دیا گیا ہے اور اس کے لیے سزا مقرر کی گئی ہے۔ چنانچہ بائبل میں زنا (Adultery) کی سزا قتل بیان ہوئی ہے کہ:

''اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتا پکڑا جائے تو وہ دونوں مار ڈالے جائیں۔'' (استثناء 22:22)

مولانا شبلی نعمانی کی رائے:

احادیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بن بیاہے کے سو دُرّے اور بیاہوں کے لیے رجم کا حکم ہے۔ (سیرت النبیؐ، جلد دوم، ص 84۔ طبع 2001ء مکتبہ مدنیہ لاہور)

ایک عقلی دلیل:

عقل و حکمت اور عدل و انصاف کی رُو سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جرمِ زنا کی سزا کے بارے میں اسلام کا منشا کیا ہے؟ اسلامی شریعت نے ایک ایسے شخص کے ارتکابِ زنا میں کہ جس کو اپنی فطری جنسی خواہش پوری کرنے کا کوئی جائز ذریعہ حاصل نہیں ہوسکا ...... اور ایک ایسے شخص کے ارتکابِ زنا میں کہ جس کو اس کی فطری صنفی خواہش پوری کرنے کا ایک جائز ذریعہ میسر آچکا ہے...... بہر حال فرق کیا ہے اور دونوں کی حالتوں کے

اختلاف کی بنا پر ان کے لیے الگ الگ سزائیں مقرر کی ہیں۔

فرض کیجئے دو عورتیں زنا کی مرتکب ہوتی ہیں۔ ایک کنواری اور دوسری شادی شدہ عورت ہے۔ پہلی عورت اپنی جنسی خواہش کے ہیجان میں تسکین کا کوئی جائز راستہ نہیں پاتی اور زنا کا ارتکاب کرتی ہے۔ دوسری عورت ایک شوہر کی بیوی ہے۔ اگر اس کا شوہر اس کے لیے وجہ تسکین نہیں بنتا تو وہ عورت اس سے خلع لے کر کسی اور مرد سے نکاح بھی کر سکتی ہے۔ لیکن اگر وہ ایک خاوند کی بیوی ہوتے ہوئے مرتکب زنا ہوتی ہے تو اس کا یہ فعل اس کے شوہر کی حق تلفی، اس سے بدترین خیانت اور پرلے درجے کی بے وفائی ہے۔ اس نے اپنے خاوند سے باندھے ہوئے اس معاہدے کا سرِ عنوان مٹا ڈالا ہے۔ جس معاہدے کو قرآن مجید نے ''میثاق غلیظ'' یعنی پختہ معاہدے سے تعبیر کیا ہے۔ کیا ان دونوں عورتوں کا مقدمہ ایک جیسا ہے؟ نہیں! ہماری عقل ان کو دو مختلف مقدمے قرار دیتی ہے کیا ان دونوں عورتوں کا جرمِ زنا ایک ہی درجے کا ہے؟ نہیں! ہماری بصیرت کہتی ہے کہ دونوں کا جرم یکساں درجے کا نہیں ہے بلکہ متفاوت درجوں کا ہے۔ پھر اگر ایسا ہے تو کیا، ان دونوں کو ایک جیسی سزا ملنی چاہئے؟ ہرگز نہیں! عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ چونکہ کنواری عورتوں کا جرم نسبتاً کم ہے اور شادی شدہ عورت کا نسبتاً زیادہ، لہٰذا سزا میں بھی یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہئے۔ کیا ایک فطری اور عقلی شریعت کے لیے یہ امر ضروری نہیں کہ وہ پہلی مجرمہ کو نسبتاً کم اور دوسری مجرمہ کو نسبتاً زیادہ سزا دے؟

اسی حکمت کے پیشِ نظر اسلامی قانون میں غیر شادی شدہ زانی اور غیر شادی شدہ زانیہ کے لیے تو سو سو کوڑوں کی سزا مقرر کی گئی ہے مگر شادی شدہ زانی اور شادی شدہ زانیہ کے لیے رجم کی حد رکھی گئی ہے۔ دو مختلف صورتوں کو یکساں حیثیت دے کر ان کے لیے ایک ہی سزا تجویز کرنا کسی طور پر بھی عقل و حکمت اور عدل و انصاف کے قرینِ قیاس نہیں ہے اور جو لوگ شریعت کے تمام تر احکامات کو عقل و حکمت پر مبنی قرار دیتے ہیں ان کے لیے تو اس سے انکار کے لیے قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اسلامی قانون میں شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کی

سزا مقرر ہے اور اس امر کی تائید میں قرآن مجید کے قرائن وشواہد ملتے ہیں ، اس کے ثبوت میں سنت نبویہ کے نصوص موجود ہیں ، اس کی حمایت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا تعامل شامل ہیں، اس پر ائمہ مجتہدین متفق ہیں، اس کے بارے میں امت کے فقہاء ، محدثین اور مفسرین کے درمیان اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے اور اس پر قرنِ اول سے لے کر آج تک امت کا عملی تواتر اور اجماع ہے۔ لہٰذا ایسے منصوص، متواتر اور اجماعی معاملے میں اختلافِ رائے کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں ہے۔ ایسا اختلافِ رائے گمراہی اور ضلالت کے سوا کچھ نہیں اور یہ محض انکارِ حدیث کا شاخسانہ ہے۔



باب نمبر 10:

قتلِ خطا میں دیت (Blood Money) کا مسئلہ

حدیث وسنت سے ثابت دیت کے مسئلے میں بھی غامدی صاحب اُمت مسلمہ کے متفقہ اور اجماعی موقف کے خلاف ہیں۔ علمائے اسلام کا اس پر اتفاق اور اجماع ہے کہ قتل خطا کی دیت مقرر ہے جو کہ سو اونٹ یا اُس کی قیمت ہے اور یہ کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔ مگر غامدی صاحب نہ تو دیت کی مقررہ مقدار کو مانتے ہیں اور نہ عورت اور مرد کی دیت کے فرق کو۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اسلام نے دیت کی کسی خاص مقدار کا ہمیشہ کے لیے تعین کیا ہے، نہ افراد کے لحاظ سے دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھیرائی ہے۔" ......
"عورت کی دیت، اس زمانے کے ارباب حل وعقد اگر چاہیں تو پوری مقرر کر سکتے ہیں۔"

(میزان، حصہ اوّل، صفحہ 218، طبع مئی 1985ء، لاہور)

پھر ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

"قرآن نے خود دیت کی کسی خاص مقدار کا تعین کیا ہے نہ عورت اور مرد، غلام اور آزاد، مسلم اور غیر مسلم کی دیتوں میں کسی فرق کی پابندی ہمارے لیے لازم ٹھیرائی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دیت کے فیصلے اپنے زمانے میں عرب کے دستور کے مطابق کیے۔ فقہ وحدیث کی کتابوں میں دیت کی جو مقداریں بیان ہوئی ہیں، وہ اسی دستور کے مطابق ہیں۔"

(میزان ص623، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

لیکن غامدی صاحب کا مذکورہ موقف ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حدیث و سنت اور اجماعِ اُمت کے خلاف ہے۔

قرآن اور دیت:

جہاں تک قرآن حکیم میں قتل خطا کی دیت کا تعلق ہے تو اس کے واجب ہونے کا ثبوت درج ذیل آیت میں ملتا ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ اِلَّا اَنْ يَّصَّدَّقُوْا﴾ (النساء: 92)

''کسی مومن کا یہ کام نہیں ہے کہ دوسرے مومن کو قتل کرے مگر یہ کہ اس سے چوک ہو جائے اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کر دے اور مقتول کے وارثوں کو دیت دی جائے، البتہ یہ کہ وہ دیت معاف کر دیں۔''

اس آیت کے حکم کے بارے میں امام ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ:

((لما لم يكن مقدار الدية مبينا فى الكتاب كان فعل النبى ﷺ فى ذلك وارد مورد البيان وفعله ﷺ اذا ورد مورد البيان فهو على الوجوب.)) (احکام القرآن ج2، ص239)

''چونکہ الکتاب یعنی قرآن میں دیت کی مقدار بیان نہیں ہوئی ہے اس لیے نبی کریم ﷺ کے عمل سے اس بارے میں وضاحت مل جاتی ہے اور نبی کریم ﷺ کے عمل کی وضاحت سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس آیت میں صرف دیت کا واجب ہونا مراد ہے۔''

1۔ سنت اور دیت:

احادیث میں قتل خطا کی دیت کی مقدار مقرر ہے جو کہ سو اونٹ یا اُس کے برابر قیمت ہے۔

1۔ "اِنَّ فِی النَّفْسِ مِائَةً مِنَ الْاِبِلِ."

(سنن نسائی، کتاب القسامہ والقود والدیات، حدیث:4861)

(موطا امام مالک، کتاب العقول)

"بے شک جان کی صورت میں (دیت کی مقدار) سو اونٹ ہیں۔"

2۔ "عَقْلُ الْمَرْءَةِ مِثْلُ عَقْلِ الرَّجُلِ حَتّٰی یَبْلُغَ الثُّلُثَ مِنْ دِیَتِهَا."

(سنن نسائی، حدیث:4809)

"(جراحات میں) عورت کی دیت مرد کی دیت کے برابر ہے بشرطیکہ دیت کی مقدار کل دیت کے ایک تہائی $\frac{1}{3}$ سے زیادہ نہ ہو۔"

یہ حدیث جراحات یعنی اعضاء کے تلف ہونے یا زخموں کی صورت میں دیت کے بارے میں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عورت کی دیت جراحات میں بھی صرف اس حد تک مرد کی دیت کے برابر ہوتی ہے جب دیت کی مقدار کل دیت (100 اونٹ یا ان کی قیمت) کے ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔ جب عورت کی دیت کی مقدار کل دیت کے ایک تہائی سے بڑھ جائے گی تو پھر مرد اور عورت کی دیت میں برابری نہیں رہے گی بلکہ دونوں میں فرق ہو جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب جراحات میں مرد اور عورت کی دیت میں فرق ہے تو پھر ساری دیت میں کیوں فرق نہیں ہے۔ ایسی کوئی صحیح حدیث موجود نہیں جس میں یہ ہو کہ مرد اور عورت کی دیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

2۔ اجماعِ امت اور دیت:

قتلِ خطاء میں عورت کی دیت مرد کے مقابل میں نصف ہونے پر امتِ مسلمہ کا اجماع ہے۔ اسی حقیقت کو علامہ ابن رُشد اپنی کتاب " بدایة المجتهد " میں ائمہ اربعہ کے متفقہ مسلک کے طور پر بیان فرماتے ہیں:

1۔ ((اما دية المرءة فانهم اتفقوا على النصف من دية الرجل فی

النفس فقط .)) (بدایۃ المجتہد، ج2، ص315)

"باقی رہا عورت کا معاملہ تو اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے آدھی ہے۔"

2۔ التشریع الجنائی میں عبدالقادر عودہ شہید لکھتے ہیں کہ عورت کی نصف دیت پر پوری امت متفق ہے۔

((ومن المتفق علیہ ان دیۃ المرء ۃ علی النصف من دیۃ الرجل فی القتل .)) (التشریع الجنائی، ج1، ص669)

"اس امر پر امت کا اتفاق رائے ہے کہ قتل (خطاء) کی صورت میں عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف ہوگی۔"

اب اگر اجماع امت بھی دین میں حجت ہے اور وہ یقیناً حجت ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی قانون میں قتلِ خطاء کی صورت میں عورت کی دیت مرد سے نصف ہے۔ اور اس بارے میں غامدی صاحب کا موقف صحیح نہیں ہے۔

3۔ حاصل بحث:

حاصلِ بحث یہ ہے کہ قانون اسلامی میں قتل خطاء کی صورت میں دیت کی مقدار سو اونٹ مقرر ہے، البتہ عورت کی دیت مرد کی دیت سے نصف رکھی گئی ہے۔ قرآن وسنت سے اسی کی تائید ہوتی ہے اور تعامل صحابہ واجماع امت سے بھی یہی امر ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا غامدی صاحب کا یہ موقف غلط ہے کہ اسلام میں دیت کی مقدار مقرر نہیں ہے اور یہ کہ عورت اور مرد کی دیت برابر ہے۔ عورت پیداواری عامل یا معاشی طور پر کسی کی کفیل نہیں ہوتی۔ اس لیے بالعموم اس کی ہلاکت سے خاندان یا ورثاء کو اس قدر مالی نقصان نہیں اٹھانا پڑتا جس قدر مالی نقصان ایک مرد کے مر جانے سے اٹھانا پڑتا ہے۔ اسی طرح وراثت میں بھی قرآن نے مرد کے مقابلے میں عورت کا حصہ نصف قرار دیا ہے اور مالی معاملات میں بھی آدھی گواہی رکھی ہے۔

باب نمبر 11:

رویت ہلال کا مسئلہ

غامدی صاحب حدیث وسنت سے ثابت رویت ہلال کے شرعی حکم کو بھی نہیں مانتے۔ اُن کا دعویٰ یہ ہے کہ شریعت میں کسی قمری مہینے (رمضان یا شوال وغیرہ) کو شروع کرنے کے لیے چاند دیکھنے کی کوئی پابندی موجود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے افق پر چاند کی پیدائش اور موجودگی ہی کافی ہے خواہ وہ نظر نہ بھی آ رہا ہو۔

چنانچہ وہ اپنے ماہنامے اشراق میں لکھتے ہیں کہ:

> ''مہینے کی تعیین کے لیے چاند دیکھنے کو لازم نہیں کیا گیا...... علم کی ترقی نے یہی صورت انتیس کے بارے میں بھی پیدا کر دی ہے۔ اب ہم پوری قطعیت کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ دنیا کے لیے چاند کی پیدائش کب ہوگی...... گھڑی ایجاد ہو جانے کے بعد ہم اپنی نمازوں کے لیے جس طرح سورج کا طلوع وغروب دیکھنے کے پابند نہیں رہے، اسی طرح قمری مہینوں کی تعیین کے لیے رویت ہلال کے پابند بھی نہیں رہے۔'' (اشراق جنوری 2009ء، شذرات، ص 3، لاہور)

لیکن ہم غامدی صاحب کی اس رائے کو صحیح احادیث اور اجماع امت کے خلاف سمجھتے ہیں کیونکہ احادیث صحیحہ میں مسلمانوں کو رویت ہلال کا پابند کیا گیا ہے۔ قمری مہینہ 29 یا 30 دن کا ہو سکتا ہے اور 29 کو چاند دیکھ کر ہی رمضان کے آغاز یا عید الفطر ہونے کا اعلان کیا جا سکتا ہے۔ فقہائے اسلام نے احادیث ہی کی بنیاد پر مہینے کی تعیین کے لیے رویت ہلال یعنی چاند دیکھنے کو مناط یا علت قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قمری مہینے کے آغاز کا دارومدار چاند دیکھنے پر ہوتا ہے۔

مطلع صاف ہونے کی صورت میں اگر 29 شعبان کو چاند نظر آجائے تو اگلے دن رمضان المبارک کا پہلا روزہ ہوگا۔ اگر 29 شعبان کو باوجود مطلع صاف ہونے کے چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے 30 دن پورے کیے جائیں گے۔ اسی طرح اگر 29 رمضان المبارک کو چاند دکھائی دے گا تو اگلے روز شوال کی پہلی تاریخ اور عید الفطر ہوگی اور اگر مطلع صاف ہونے کے باوجود چاند نظر نہیں آیا تو 30 روزے پورے کیے جائیں گے۔ اسی طرح 29 کو مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں چاند دکھائی نہ دینے سے بھی 30 دن پورے کرنے ہوں گے۔

رویت ہلال سے متعلق چند صحیح احادیث یہ ہیں:

1۔ ''اِذَا رَأَيْتُمُوْهُ فَصُوْمُوْا وَاِذَا رَأَيْتُمُوْهُ فَافْطِرُوْا، فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوْا لَهٗ .'' (صحیح بخاری، حدیث 1900، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

(صحیح مسلم حدیث 2517، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ)

''جب چاند دیکھو تو روزہ رکھو، اور جب چاند دیکھ لو تو افطار کرو یعنی روزہ چھوڑ دو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن پورے کرلو۔''

2۔ ''صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ فَاِنْ غُبِّيَ عَلَيْكُمْ فَاَكْمِلُوْا .''

(صحیح بخاری، حدیث: 1909، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ، حدیث: 2499، عن ابن عمر رضی اللہ عنہما)

''چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور چاند دیکھ کر ختم کرو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کرو۔''

3۔ بخاری اور صحیح مسلم میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ، وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ، فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوْا لَهٗ ." (صحیح بخاری، حدیث: 1906) (صحیح مسلم: حدیث: 2498)

''جب تک نیا چاند نہ دیکھ لو، روزے رکھنا شروع نہ کرو اور نہ روزے رکھنا ختم کرو جب تک نیا چاند نہ دیکھ لو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن پورے کرو۔''

4۔ صحیح مسلم میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَلشَّهْرُ تِسْعٌ وَعِشْرُوْنَ فَإِذَا رَءَيْتُمُ الْهِلَالَ فَصُوْمُوْا، وَإِذَا رَءَيْتُمُوْهُ فَأَفْطِرُوْا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاقْدُرُوْا لَهُ." (صحیح مسلم، حدیث:2503)

"مہینہ انتیس دنوں کا بھی ہوتا ہے۔ پھر جب تم نیا چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو، اور جب تم چاند دیکھ لو تو روزے چھوڑ دو، لیکن اگر مطلع صاف نہ ہو تو پھر تیس دن پورے کرو۔"

5۔ صحیح مسلم میں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"إِذَا رَءَيْتُمُ الْهِلَالَ فَصُوْمُوْا، وَإِذَا رَءَيْتُمُوْهُ فَأَفْطِرُوْا، فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَصُوْمُوْا ثَلَاثِيْنَ يَوْمًا." (صحیح مسلم:2514)

"جب تم نیا چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو، اور جب تم پھر نیا چاند دیکھو تو روزہ چھوڑ دو، پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن کے روزے پورے کرو۔"

صحیحین کی ان واضح صحیح احادیث کو جو شخص بھی کھلے ذہن کے ساتھ پڑھے گا اُسے یہ حقیقت معلوم ہو جائے گی کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو اس بات کا پابند کیا ہے کہ وہ چاند دیکھ کر رمضان المبارک شروع کریں اور چاند دیکھ کر ہی عید الفطر منائیں۔ گویا رویت ہلال سنت سے ثابت شدہ حکم ہے اور اہل علم کا اسی پر اتفاق ہے۔

اب ہم غامدی صاحب کی اس نرالی منطق کا جائزہ لیتے ہیں جو وہ یہ فرماتے ہیں کہ:

"گھڑی ایجاد ہو جانے کے بعد ہم اپنی نمازوں کے لیے جس طرح سورج کا طلوع وغروب دیکھنے کے پابند نہیں رہے، اسی طرح قمری مہینوں کی تعیین کے لیے رویت ہلال کے پابند بھی نہیں رہے۔" (اشراق، جنوری 2009ء، ص 3، لاہور)

ہمارا جواب یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں گھڑی ایجاد ہوئے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ بیت چکا ہے۔ اس پورے عرصے میں آج تک اہل علم میں سے کسی نے غامدی صاحب کی طرح یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اب چونکہ گھڑی ایجاد ہو چکی ہے لہٰذا نمازوں کے لیے سورج کے طلوع وغروب کو دیکھنا فضول اور بے کار ہے۔ یہ نرالا تخیل صرف غامدی صاحب جیسے متجدد اور

منکرِ حدیث ہی کی کھوپڑی میں آیا ہے جو کسی اور کو آج تک نہیں سوجھا؟ اگر سوجھا ہے تو اس کا نام بتایا جائے۔

﴿هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

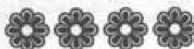
غامدی صاحب گھڑی کی ایجاد کی خوشخبری سنا کر مسلمانوں کو سورج کے طلوع و غروب کے ذریعے وقت معلوم کرنے سے باز رکھنا چاہتے ہیں لیکن اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ:

- دنیا میں ہر مسلمان نمازی گھڑی نہیں خرید سکتا۔
- وہ گھڑی سے وقت معلوم کرنا نہیں جانتا۔
- وہ ہر لحہ گھڑی اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔
- اُسے کہیں ایسی گھڑی نہیں مل سکتی جو کبھی نہ رکتی ہو، آگے پیچھے نہ ہو جاتی ہو، خراب نہ ہوتی ہو، اس کے سیل (Cell) ہمیشہ چلنے والے ہوں اور جو یہ بتائے کہ میں صبح کے 4 بجا رہی ہوں یا شام کے۔ صبح و شام کا تعین بہر حال سورج ہی کے طلوع و غروب کا مرہونِ منت ہے۔

ممکن ہے آیندہ غامدی صاحب یہ دعویٰ بھی کر دیں بلکہ فتویٰ دے دیں کہ چونکہ ٹیپ ریکارڈر ایجاد ہو چکا ہے لہٰذا اب مؤذن ہر نماز کے لیے اذان کہنے کا پابند نہیں رہا۔ وہ بس بٹن دبا کر اذان والی کیسٹ چلا دیا کرے کیونکہ اس سے بھی اذان کا مقصد تو بہر حال پورا ہو جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ سائنسی ایجادات سے دینی احکام پر عمل کرنے کے لیے مدد تو لی جا سکتی ہے مگر ان کے ذریعے سرے سے دینی احکام کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ رویت ہلال کے لیے دوربین (Telescope) وغیرہ سے مدد لی جا سکتی ہے مگر کسی رصدگاہ (Observatory) کی معلومات کے ذریعے رویت ہلال کا شرعی تقاضا ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں سعودی عرب کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے جس سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔

الغرض ہماری رائے میں حدیث و سنت سے ثابت رویت ہلال (چاند دیکھنے) کے شرعی حکم کا انکار کرنے کے بعد غامدی صاحب منکرِ حدیث قرار پاتے ہیں۔



باب نمبر 12:

حدیث وسنت سے متعلق غامدی صاحب کے فکری تضادات (Contradictions) اور ذہنی قلابازیاں

حدیث وسنت کے حوالے سے غامدی صاحب کے ہاں فکری تضادات کی بہت فراوانی ہے۔ ذیل میں اس کی چند مثالیں دی جاتی ہیں:

1۔قربانی کے بارے میں تضاد بیانی:

قربانی کے بارے میں غامدی صاحب تضاد (Contradiction) اور اُلجھاؤ (Confusion) کا شکار ہیں۔ وہ اپنی کتاب ''میزان'' ہی کے مختلف مقامات پر اس کے بارے میں الگ الگ حکم لگاتے ہیں۔ کبھی اسے قانون کہتے ہیں کبھی سنت اور کبھی اسے نفل قرار دیتے ہیں۔

(1) قربانی...... قانون ہے:

چنانچہ غامدی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ قربانی ایک قانون ہے۔

''قربانی کا جو قانون مسلمانوں کے اجماع اور تواتر عملی سے ہم تک پہنچا ہے، وہ یہ ہے......'' (میزان، ص 405، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(2) قربانی...... سنت ہے:

پھر دوسری جگہ وہ لکھتے ہیں کہ قربانی سنت ہے:

''ان (عیدین) میں جو اعمال سنت کے طور پر جاری کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

(1) صدقہ فطر (2) نماز اور خطبہ (3) قربانی (4) ایام تشریق میں ہر نماز کے بعد تکبیریں۔"

(میزان، ص 649، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(3) قربانی ...... نفل ہے:

پھر تیسری جگہ پر لکھتے ہیں کہ قربانی نفل ہے:

"یہی قربانی ہے جو حج و عمرہ کے موقع پر اور عید الاضحیٰ کے دن ہم ایک نفل عبادت کے طور پر پورے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔"

(میزان، ص 404، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ:

دروغ گو را حافظہ نباشد

اب یہ فیصلہ کرنا قارئین کا کام ہے کہ:

1۔ کیا شریعت میں کسی نفلی کام کے ثبوت کے لیے بھی اجماع اور تواترِ عملی کی شرط ہے؟

2۔ کیا نفلی عبادات بھی امت کے ہاں پورے اہتمام کے ساتھ کی جاتی ہیں؟

3۔ کیا اسلامی شریعت میں نفل بھی قانون ہوتا ہے؟

4۔ کیا دنیا میں کوئی قانون بھی نفل ہوتا ہے؟

لیکن قارئین کرام یاد رکھیں کہ

غامدی صاحب کی شریعت میں یہ سب کچھ ممکن ہے۔

2۔ حدیث سے قرآنی حکم کی تحدید ہونے میں تضاد

غامدی صاحب پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث کے ذریعے قرآن مجید کے کسی حکم کی تحدید نہیں ہو سکتی اور یہ سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی۔ کیونکہ ان کے خیال میں ایسا ہونے سے قرآن کا میزان اور فرقان ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے جو کسی حال میں صحیح نہیں۔ چنانچہ انہوں

نے لکھا ہے کہ:

''قرآن سے باہر کوئی وحی خفی یا جلی، یہاں تک کہ خدا کا وہ پیغمبر بھی جس پر یہ نازل ہوا ہے، اُس کے کسی حکم کی تحدید و تخصیص یا اس میں کوئی ترمیم و تغیر نہیں کرسکتا۔''

(میزان، ص 25، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(اصول ومبادی، ص 24، طبع فروری 2005ء، لاہور)

اپنے اس دعوے کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

حدیث سے قرآن کے نسخ اور اس کی تحدید و تخصیص کا یہ مسئلہ محض سوءِ فہم اور قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کا کوئی نسخ یا تحدید و تخصیص سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی کہ اس سے قرآن کی یہ حیثیت کہ وہ میزان اور فرقان ہے کسی لحاظ سے مشتبہ قرار پائے۔

(میزان، ص 35، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول ومبادی، ص 36، طبع فروری 2005ء، لاہور)

مگر پھر اپنے اس دعوے کے خلاف حدیث سے قرآن کے حکم کی تحدید بھی مان لی ہے اور اس کے نتیجے میں معلوم نہیں قرآن کے میزان اور فرقان ہونے کی حیثیت مشتبہ ہوگئی ہے یا نہیں ہوئی۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر قرآنی حکم:

﴿وَاضْرِبُوهُنَّ﴾ (النساء: 34)

''اور اُن کو مارو۔''

بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

''نبی کریم ﷺ نے اس کی حد 'غیر مبرح' کے الفاظ سے متعین فرمائی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایسی سزا نہ دی جائے جو کہ پایدار اثر چھوڑے۔''

(میزان، ص 423، طبع سوم 2008ء، لاہور)

(قانون معاشرت، ص 30، طبع اوّل، مئی 2005ء لاہور)

اس طرح غامدی صاحب پہلے اپنے جی سے ایک اصول گھڑتے اور پھر اپنے اس

موضوعہ اصول کا خود ہی خون کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں ایسے تضادات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

3۔ حدیث پر غور کرنے میں تضاد

غامدی صاحب کے ہاں ''اُصول سازی'' اور ''اُصول شکنی'' عام ہے۔ وہ دوسروں کو جن اُصولوں کا پابند کرتے ہیں خود اُن اُصولوں کی پابندی نہیں کرتے۔ بلکہ جو اُصول وہ اپنے لیے بناتے ہیں خود ان پر بھی کاربند نہیں ہوتے۔

احادیث پر بحث و استدلال کرنے کے لیے اُنہوں نے ایک اُصول بیان کیا ہے کہ کسی حدیث کو سمجھنے کے لیے اس باب کی تمام روایات کو سامنے رکھ کر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے مگر مرتد کی سزا کے بارے میں انہوں نے خود اپنے اس اُصول کی پابندی نہیں کی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''چوتھی چیز یہ ہے کہ کسی حدیث کا مدعا متعین کرتے وقت اس باب کی تمام روایات پیش نظر رکھی جائیں۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ آدمی حدیث کا ایک مفہوم سمجھتا ہے لیکن اسی باب کی تمام روایتوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ مفہوم بالکل دوسری صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔''

(میزان، ص 64-65، طبع سوم مئی 2008ء لاہور)

(اصول و مبادی، ص 72، طبع دوم فروری 2005ء)

مگر جب مرتد کی سزا کا معاملہ آیا تو اس پر بحث و استدلال کرتے وقت انہوں نے اس باب کی کئی احادیث چھوڑ کر صرف ایک ہی حدیث کو لے کر اپنی غلط رائے قائم کر لی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''ارتداد کی سزا کا یہ مسئلہ محض ایک حدیث کا مدعا نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔ یہ حدیث بخاری میں اس طرح نقل ہوئی ہے:

((من بدّل دینه فاقتلوه)) ''جو شخص اپنا دین تبدیل کرے، اُسے قتل کردو۔'' ہمارے فقہاء اسے بالعموم ایک حکم عام قرار دیتے ہیں جس کا اطلاق ان کے نزدیک ان سب لوگوں پر ہوتا ہے جو زمانہ رسالت سے لے کر قیامت تک اس زمین پر کہیں بھی اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں گے۔ ان کی رائے کے مطابق ہر وہ مسلمان جو اپنی آزادانہ مرضی سے کفر اختیار کرے گا، اسے اس حدیث کی رُو سے لازماً قتل کر دیا جائے گا۔''

(برہان، ص 139، طبع چہارم، جون 2006ء)

وہ مزید فرماتے ہیں کہ:

''لیکن فقہا کی یہ رائے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم تو بیشک ثابت ہے مگر ہمارے نزدیک یہ کوئی حکم عام نہ تھا بلکہ صرف اُنہی لوگوں کے ساتھ خاص تھا جن میں آپ کی بعثت ہوئی اور جن کے لیے قرآن مجید میں اُمیین یا مشرکین کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔''

(برہان، ص 140، طبع چہارم، جون 2006ء)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:

''ہمارے فقہاء کی غلطی یہ ہے کہ اُنہوں نے قرآن وسنت کے باہمی ربط سے اس حدیث کا مدعا سمجھنے کے بجائے اسے عام ٹھہرا کر ہر مرتد کی سزا موت قرار دی اور اس طرح اسلام کے حدود و تعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کر دیا جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں ہے۔''

(برہان، ص 143، طبع چہارم، جون 2006ء)

دیکھیے، مرتد کی سزا کے بارے میں غامدی صاحب اپنے مذکورہ اصول حدیث کے برعکس صرف ایک ہی مذکورہ حدیث کو مدار بنا کر اس معاملے میں بحث و استدلال فرما رہے ہیں (اور وہ بھی لغت عرب کے خلاف معنی لے رہے ہیں) اور اس باب کی درج

ذیل احادیث سے اُنہوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔

1۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی متفق علیہ حدیث ہے کہ:

((عن عبدالله قال: قال رسول الله ﷺ: لا یحل دم امرئ مسلم یشهد أن لا اله اِلاّ الله ، وانّی رسول الله الا باحدی ثلاث: النفس بالنفس ، والثیب الزانی ، والمفارق لدینه التارك للجماعة .)) (صحیح بخاری، رقم:2878)

''حضرت عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، سوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، دوسری یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو اور تیسری یہ کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جائے۔''

یہی حدیث صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی اور مسند احمد میں بھی موجود ہے اور اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی روایت کیا ہے۔

2۔ دوسری حدیث جس سے غامدی صاحب نے مرتد کے مسئلے میں چشم پوشی کی ہے وہ سنن ابی داؤد کی یہ حدیث ہے کہ:

((عن ابی امامة بن سهل قال: كنا مع عثمان وهو محصور فی الدار ، وكان فی الدار مدخل من دخله سمع كلام من علی البلاط ، فدخله عثمان ، فخرج الینا وهو متغیر لونه ، فقال: انهم لیتوا عدوننی بالقتل اٰنفاً ، قال: قلنا یكفیكهم الله یا امیر المؤمنین! قال: ولم یقتلوننی؟ سمعت رسول الله یقول: لا یحل دم امرئ مسلم الآ باحدی ثلاث: كفر بعد إسلام ، أو

زنـا بـعد احصان، أو قتل نفس بغير نفس، فوالله ما زنيت في جـاهـلية ولا في إسلام قط، ولا احببت أن لي بديني بدلا منذ هداني الله، ولا قتلت نفسا، فبم يقتلونني؟))

(سنن ابی داؤد، کتاب الدیات، حدیث نمبر 4502)

''حضرت ابو امامہ بن سہل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور دوسرے لوگ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے، جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے۔ اس گھر کا ایک راستہ تھا جس کے اندر کھڑا آدمی گھر کی بالکونی پر کھڑے لوگوں کی بات آسانی سے سن سکتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لائے۔ ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ باہر نکلے اور فرمایا: ابھی یہ لوگ مجھے قتل کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان کے مقابلے میں اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ پھر فرمایا: یہ لوگ مجھے کیوں قتل کر دینا چاہتے ہیں؟ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، سوائے اس کے کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہو۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرے۔ (مرتد ہو جائے) یا شادی کے بعد زنا کرے، یا کسی کو ناحق قتل کر دے۔ اللہ کی قسم! میں نہ تو جاہلیت میں زنا کا مرتکب ہوا اور نہ اسلام لانے کے بعد۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنا دین بدلنا کبھی پسند نہیں کیا جب سے اللہ نے مجھے ہدایت عطا فرمائی ہے۔ تیسرے یہ کہ میں نے کسی کو ناحق قتل بھی نہیں کیا۔ پھر یہ لوگ کس بنا پر مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟''

اس طرح غامدی صاحب اپنے بنائے ہوئے اُصولوں کی خود ہی دھجیاں بکھیرتے اور فکری تضادات کا شکار ہوتے ہیں۔ خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو گمراہ کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

4۔ سنتوں کی تعداد میں تضاد:

جناب غامدی صاحب کے ہاں اُمورِ سنت اور دین میں بھی تضادات پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ داڑھی کو کبھی سنت اور دین کہتے ہیں اور کبھی اسے سنت اور دین سے خارج سمجھتے ہیں۔ اُن کے ہاں ایک وقت میں وضو اور تیمم سنت اور دین ہوتے ہیں اور دوسرے وقت وہ ان دونوں کو سنت اور دین کے دائرے سے نکال باہر کرتے ہیں۔ وہ کبھی حرمین شریفین کی حرمت کو سنت اور دین قرار دیتے ہیں اور کبھی اسے سنت اور دین سے الگ کر دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں کبھی اشہرِ حرم (حرمت والے مہینے) سنت اور دین ہوتے ہیں اور کبھی دین نہیں ہوتے۔ کبھی طلاق اُن کے نزدیک سنت اور دین ہے اور کبھی سنت اور دین نہیں ہے۔ کبھی سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت سنت ہوتی ہے اور کبھی اُسے سنت کے اُمور سے خارج کر دیا جاتا ہے، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ہر بار وہ اپنے اس تغیر و تبدل کو پوری ''قطعیت'' کے ساتھ سنت اور دین کہتے پھرتے ہیں اور پھر بالکل ''قطعیت'' کے ساتھ اُسے سنت اور دین کے اعزاز سے محروم بھی کر دیتے ہیں ؎

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی

غامدی صاحب جون 1991ء میں داڑھی کو سنت مانتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط بنام جناب شیر محمد اختر صاحب میں لکھتے ہیں کہ:

''رجم کا معاملہ چونکہ دوسری قسم ہی سے تعلق رکھتا ہے، اس وجہ سے میں نے اس پر بحث کی اور عام رائے کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ ورنہ داڑھی، ختنہ اور اس طرح کی بے شمار دوسری چیزوں میں سنت کو مستقل بالذات شارع مان کر ہی دین میں شامل قرار دیتا ہوں۔''

(جاوید غامدی صاحب کا خط بنام جناب شیر محمد اختر صاحب، بحوالہ ماہنامہ اشراق، شمارہ جون 1991ء، ص 32)

اس کے بعد جب مئی 1998ء میں غامدی صاحب نے چالیس (40) اُمور پر مشتمل سنت اور دین کی ایک مکمل اور جامع فہرست جاری فرمائی تو اس میں داڑھی کی سنت کو شامل نہیں کیا اور اسے اس فہرست سے غائب کر دیا۔ چنانچہ اُنہوں نے یہ لکھا ہے کہ:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے، جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد، اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ، اپنے ماننے والوں میں، دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے:

(1) اللہ کا نام لے کر، اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے مواقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) جانوروں کا تذکیہ۔ (6) نکاح۔ (7) نکاح کا خطبہ۔ (8) مونچھیں پست رکھنا۔ (9) زیرِ ناف کے بال مونڈنا۔ (10) بغل کے بال صاف کرنا۔ (11) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (12) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (13) ناک، منہ اور دانتوں ک صفائی۔ (14) استنجا۔ (15) غسلِ جنابت۔ (16) میت کا غسل۔ (17) تجہیز و تکفین۔ (18) تدفین۔ (19) وضو۔ (20) تیمم۔ (21) اذان۔ (22) اقامت۔ (23) نماز کے لیے مساجد کا اہتمام۔ (24) شب و روز کی پانچ لازمی نمازیں۔ (25) نمازِ جمعہ۔ (26) نمازِ عیدین۔ (27) نمازِ جنازہ۔ (28) روزہ۔ (29) اعتکاف۔ (30) عید الفطر۔ (31) صدقہ عید الفطر۔ (32) زکوٰۃ۔ (33) ہدی۔ (34) طواف۔ (35) حرمین شریفین کی حرمت۔ (36) اشہر حرم۔ (37) حج و عمرہ۔ (38) عید الاضحیٰ۔ (39) عید الاضحیٰ کی قربانی۔ (40) ایامِ تشریق میں نمازوں کے بعد تکبیریں۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ جس طرح صحابہ کے اجماع اور قولی تواتر سے ملا ہے، یہ اسی طرح ان کے اجماع اور عملی تواتر سے ملی، اور قرآن

ہی کی طرح ہر دور میں، اُمت کے اجماع سے ثابت قرار پائی ہے۔''

(ماہنامہ اشراق، شمارہ مئی 1998، ص35)

اس کے بعد اپریل 2002ء میں غامدی صاحب نے چالیس (40) سنتوں کے اس دین کو صرف ستائیس (27) سنتوں میں تبدیل کر کے اسی دین کا ایک نیا مکمل ایڈیشن تیار کر لیا۔

چنانچہ سنتوں کی ایک اور فہرست جاری فرماتے ہوئے لکھا:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے، جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد، اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ، اپنے ماننے والوں میں، دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے:

(1) اللہ کا نام لے کر، اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے مواقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) مونچھیں پست رکھنا۔ (6) زیر ناف کے بال مونڈنا۔ (7) بغل کے بال صاف کرنا۔ (8) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (9) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (10) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ (11) استنجا۔ (12) حیض و نفاس میں زن و شوہر کے تعلق سے اجتناب۔ (13) حیض و نفاس کے بعد غسل۔ (14) غسلِ جنابت۔ (15) میت کا غسل۔ (16) تجہیز و تکفین۔ (17) تدفین۔ (18) عید الفطر۔ (19) عید الاضحیٰ۔ (20) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔ (21) نکاح وطلاق اور ان کے متعلقات۔ (22) زکوۃ اور اس کے متعلقات۔ (23) نماز اور اس کے متعلقات۔ (24) روزہ اور صدقہ فطر۔ (25) اعتکاف۔ (26) قربانی۔ (27) حج وعمرہ اور ان کے متعلقات۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے

اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

(میزان، ص10، طبع دوم، اپریل 2002ء)

سنت کی اس ترمیم شدہ فہرست پر نظر ڈالی جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اس سے داڑھی حسب معمول غائب ہے۔ اس کے علاوہ دیگر تیرہ (13) اُمور کو سنت سے خارج کر دیا گیا ہے جن میں وضو، تیمم، حرمین شریفین کی حرمت، ہدی، طلاق، اشہر حرم، نمازِ عیدین، نمازِ جنازہ، نمازِ جمعہ، نماز کے لیے مساجد کا اہتمام وغیرہ شامل ہیں۔

پھر اس کے بعد زمانے نے ایک اور کروٹ لی تو غامدی صاحب نے بھی فروری 2005ء میں سنت کی مزید ترمیم شدہ فہرست جاری فرماتے ہوئے لکھا:

''سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے، جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد، اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ، اپنے ماننے والوں میں، دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے وہ یہ ہے:

عبادات:

(1) نماز۔ (2) زکوٰۃ اور صدقہ فطر۔ (3) روزہ و اعتکاف۔ (4) حج و عمرہ۔ (5) قربانی اور ایامِ تشریق کی تکبیر۔

معاشرت:

(1) نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات۔ (2) حیض و نفاس میں زن و شوہر کے تعلق سے اجتناب۔

خورد و نوش:

(1) سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت۔ (2) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔

رسوم و آداب:

(1) اللہ کا نام لے کر، اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے مواقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) مونچھیں پست رکھنا۔ (6) زیر ناف کے بال مونڈنا۔ (7) بغل کے بال صاف کرنا۔ (8) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (9) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (10) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ (11) استنجا۔ (12) حیض و نفاس کے بعد غسل۔ (13) غسلِ جنابت۔ (14) میت کا غسل۔ (15) تجہیز و تکفین۔ (16) تدفین۔ (17) عید الفطر۔ (18) عید الاضحیٰ۔

سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

(اُصول و مبادی، ص 10، 11، طبع دوم، فروری 2005ء، لاہور)

(میزان، ص 14، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

اب ہم سنت کی اس مزید ترمیم شدہ تیسری فہرست پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ اس میں:

1۔ خورد و نوش کے تحت ''سؤر، خون، مردار اور خدا کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کی حرمت'' کے عنوان سے ایک نئی سنت کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ لیکن سنت کی ستائیس (27) کی تعداد کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ترکیب کی گئی ہے کہ ''اعتکاف'' کی الگ سنت کو روزے کی سنت کے ساتھ ملا دیا گیا تا کہ گنتی کا میزانیہ (Total) پورا رہے اور کسی ممکنہ اعتراض سے بچا جا سکے۔ ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

2۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں ''روزہ اور صدقہ فطر'' ایک سنت تھی۔ تیسری ترمیم شدہ فہرست میں ''روزہ اور اعتکاف'' ایک سنت قرار پائی۔

3۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں زکوٰۃ کی سنت کے ساتھ صدقہ فطر کی سنت شامل نہ تھی بلکہ وہ اس سے الگ ایک سنت تھی مگر تیسری ترمیم شدہ فہرست میں زکوٰۃ کی سنت کے ساتھ صدقہ فطر کی سنت کو ملا کر دو سنتوں کی ایک سنت بن گئی۔

4۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں نماز کی سنت کے ساتھ اس کے متعلقات بھی شامل تھے مگر تیسری ترمیم شدہ فہرست میں نماز کی سنت سے اس کے متعلقات غائب کر دیے گئے۔

5۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں حج و عمرہ کی سنت کے ساتھ اُن کے متعلقات بھی شامل تھے مگر تیسری ترمیم شدہ فہرست میں حج و عمرہ کے متعلقات حذف کر دیے گئے۔

6۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں اعتکاف ایک مستقل سنت تھی جسے تیسری ترمیم شدہ فہرست میں روزے کے ساتھ شامل کر کے ''روزہ و اعتکاف'' کی ایک ہی سنت بنا لی گئی، اس طرح گویا اب اعتکاف نصف سنت قرار پائی جو پہلے پوری سنت تھی۔

7۔ دوسری ترمیم شدہ فہرست میں قربانی ایک مستقل اور الگ سنت تھی مگر تیسری ترمیم شدہ فہرست میں اُس کے ساتھ ''ایام تشریق کی تکبیر'' نامی سنت شامل کر کے اُسے ایک ہی سنت بنا لیا گیا۔

یاد رہے کہ ''ایامِ تشریق کی تکبیروں'' والی سنت مئی 1998ء کی پہلی فہرست میں موجود تھی جو اپریل 2002ء کی فہرست سے خارج کر دی گئی اور پھر 2005ء کی فہرست میں اُسے دوبارہ شامل کر لیا گیا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ غامدی صاحب نے سنت اور دین کو بازیچۂ اطفال سمجھ رکھا ہے جس میں وہ اپنے من مانے طریقے سے ''قطعیت'' کے ساتھ حسب خواہش ردّ و بدل کرتے رہتے ہیں، اور اس شریعت سازی کے نتیجے میں ان کے ہاں کھلے تضادات جنم لیتے ہیں۔

5۔ فرض اور سنت کی اصطلاح کا تضاد:

غامدی صاحب کے ہاں فرض اور سنت کی اصطلاحوں کا تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ وہ ایک ہی چیز کو کسی جگہ فرض کہتے ہیں اور کہیں اُسے سنت قرار دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب وہ پورے دین کو ستائیس (27) سنتوں میں محدود کر دیتے ہیں تو وہاں نماز اور روزے کو بھی سنت شمار کرتے ہیں مگر دوسرے مقامات پر نماز اور روزے کو فرض قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی تحریروں میں فرض اور سنت کی اصطلاحوں کا یہ تضاد اور مغالطہ بالکل واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔

> ''سنت سے ہماری مراد دینِ ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی ﷺ نے اس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے .... اس ذریعے سے جو دین ہمیں ملا ہے، وہ یہ ہے:
>
> (1) اللہ کا نام لے کر، اور دائیں ہاتھ سے کھانا پینا۔ (2) ملاقات کے مواقع پر السلام علیکم اور اس کا جواب۔ (3) چھینک آنے پر الحمد للہ، اور اس کے جواب میں یرحمک اللہ۔ (4) نومولود کے دائیں کان میں اذان، اور بائیں میں اقامت۔ (5) مونچھیں پست رکھنا۔ (6) زیرِ ناف کے بال مونڈنا۔ (7) بغل کے بال صاف کرنا۔ (8) لڑکوں کا ختنہ کرنا۔ (9) بڑھے ہوئے ناخن کاٹنا۔ (10) ناک، منہ اور دانتوں کی صفائی۔ (11) استنجا۔ (12) حیض و نفاس میں زن و شوہر کے تعلق سے اجتناب۔ (13) حیض و نفاس کے بعد غسل۔ (14) غسلِ جنابت۔ (15) میت کا غسل۔ (16) تجہیز و تکفین۔ (17) تدفین۔ (18) عید الفطر۔ (19) عید الاضحیٰ۔ (20) اللہ کا نام لے کر جانوروں کا تذکیہ۔ (21) نکاح و طلاق اور ان کے متعلقات۔ (22) زکوٰۃ اور

اس کے متعلقات ۔ (23) نماز اور اس کے متعلقات ۔ (24) روزہ اور صدقہ فطر۔ (25) اعتکاف۔ (26) قربانی۔ (27) حج وعمرہ اور ان کے متعلقات۔
سنت یہی ہے اور اس کے بارے میں یہ بالکل قطعی ہے کہ ثبوت کے اعتبار سے اس میں اور قرآن مجید میں کوئی فرق نہیں ہے۔'' (میزان ص10، طبع دوم اپریل 2002ء)

اس مقام پر غامدی صاحب نے نماز، روزے اور زکوۃ کو (نمبر 22، 23، 24) کو بھی سنت میں شمار کیا ہے مگر اور جگہوں پر نماز، روزے اور زکوۃ کو فرض قرار دیا ہے۔ چنانچہ نماز کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

1۔ ''نماز مسلمانوں پر شب و روز میں پانچ وقت فرض کی گئی ہے۔''

(قانون عبادت، ص63، طبع اپریل 2005ء)

(میزان ص308، طبع سوم مئی 2008ء، لاہو)

2۔ اسی طرح روزے کو پہلے سنت قرار دینے کے بعد فرض قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''روزوں کے لیے رمضان کا مہینہ خاص کیا گیا ہے، اس لیے جو شخص اس مہینے میں موجود ہو، اس پر فرض ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔''

(قانون عبادت، ص139، طبع اپریل 2005ء)

(میزان ص369، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

3۔ غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''میزان'' میں قانونِ معیشت کے تحت یہ عنوان قائم کیا ہے کہ:

''زکوۃ کی فرضیت۔'' (میزان، ص137، طبع دوم اپریل 2002ء)

غامدی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

''یہ (زکوۃ) پہلے سے موجود ایک سنت تھی جسے قرآن نے زندہ کیا اور نبی ﷺ نے اللہ کے حکم سے مسلمانوں میں جاری کر دیا۔'' (میزان، ص138، طبع دوم اپریل 2002ء)

4۔ غامدی صاحب زکوۃ کو پہلے قانون معیشت کے عنوان کے تحت بیان کرتے ہیں۔ (میزان ص137، طبع دوم اپریل 2002ء، لاہور)۔ پھر اسے قانون عبادات میں لے آئے۔

(میزان ص 345، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور) گویا 2002ء میں غامدی صاحب کے ہاں زکوٰۃ عبادت نہ تھی اور پھر 2008ء میں 6 برس بعد زکوٰۃ عبادت بن گئی۔ فیاللعجب!

اس سے معلوم ہوا کہ غامدی صاحب اصطلاحات وغیرہ کے ذریعے مغالطہ دینے کے عادی ہیں اور یہ چیز اُن کے ہاں ایک واضح تضاد کی صورت میں موجود ہے۔

6۔ قرآن وسنت کے مقدم ومؤخر ہونے میں تضاد

غامدی صاحب کے ہاں یہ بھی کھلا تضاد موجود ہے کہ وہ کبھی قرآن کو سنت پر مقدم مانتے ہیں اور کبھی سنت کو قرآن سے مقدم قرار دیتے ہیں۔

چنانچہ وہ ایک جگہ قرآن کو ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہر شخص پابند ہے کہ اس (قرآن) پر کسی چیز کو مقدم نہ ٹھہرائے۔''

(میزان ص 24، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

پھر اسی کتاب ''میزان'' میں آگے چل کر سنت کو قرآن سے مقدم قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''سنت قرآن کے بعد نہیں بلکہ قرآن سے مقدم ہے۔''

(میزان ص 47، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

ہم جانتے ہیں کہ غامدی صاحب نے ان دونوں مقامات پر حرف ''پر'' اور حرف ''سے'' کا مغالطہ دیا ہے مگر یہ مغالطہ اس وقت مغالطہ نہیں رہتا بلکہ ایک کھلا تضاد بن کر سامنے آتا ہے جب اسے اُردو زبان کے درج ذیل دو جملوں کی روشنی میں دیکھا جائے:

1۔ اللہ تعالیٰ پر کسی چیز کو مقدم نہیں ٹھہرانا چاہیے۔

2۔ نبی ﷺ اللہ تعالیٰ سے مقدم ہیں۔

کیا کوئی آدمی جو معمولی اُردو زبان بھی جانتا ہے مذکورہ دونوں فقروں میں کھلا تضاد نہیں پائے گا؟

7۔ حدیث سے دین کے عقائد واعمال ثابت بھی ہوتے ہیں اور ثابت

نہیں بھی ہوتے ہیں:

غامدی صاحب پہلے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث نہ تو دین کا ماخذ ہے اور نہ اس سے دین کا کوئی عقیدہ یا عمل ثابت ہوتا ہے لیکن پھر حدیث ہی سے عقائد، اعمال اور احکام ثابت کرتے ہیں۔

چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، اُن کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اُن سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس مضمون کی تمہید میں ہم نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے۔'' (میزان ص 61، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

لیکن اس کے بعد وہ حدیث سے عقائد بھی ثابت کرتے ہیں اعمال بھی اور دینی احکام بھی۔ اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1) حج بدل کا جواز:

غامدی صاحب نے محض حدیث ہی کی بنیاد پر حج بدل کو مانا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

''حج و عمرہ سے متعلق چند باتیں ان کے علاوہ روایتوں میں نقل ہوئی ہیں...... قبیلہ خثعم کی ایک عورت نے پوچھا: یارسول اللہ! میرے باپ پر حج فرض ہے مگر وہ اتنا بوڑھا ہے کہ سواری پر ٹھہر بھی نہیں سکتا۔ کیا میں اُس کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: کر سکتی ہو۔'' (بحوالہ بخاری رقم 1855، مسلم رقم: 3251)

(میزان، ص 400، طبع سوم 2008ء، لاہور)

مذکورہ حدیث سے انہوں نے حج بدل کا جواز ثابت کیا ہے۔

(2) مدینہ منورہ کا حرم ہونا:

اسی طرح انہوں نے حدیث ہی کے سہارے مدینے کا حرم ہونا ثابت کیا ہے۔

چنانچہ وہ اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھتے ہیں:

''حرم مدینہ کے بارے میں آپ ﷺ نے لوگوں کو متنبہ فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح مکہ کو حرم ٹھیرایا ہے، میں نے اسی طرح مدینہ کو حرم ٹھیرایا ہے۔ لہٰذا اس کے دونوں کناروں کے درمیان میں کوئی شخص نہ کسی کا خون بہائے، نہ شکار کرے، نہ قتال کے لیے ہتھیار اُٹھائے اور نہ کسی درخت کے پتے جھاڑے، اِلّا یہ کہ جانوروں کو کھلانا پیشِ نظر ہو۔'' (بحوالہ بخاری رقم 1867، مسلم، رقم: 3317، 3336)

(میزان، ص 401، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

(3) نبی کریم ﷺ کی شفاعت کا عقیدہ:

اسی طرح غامدی صاحب نے حدیث ہی کے ذریعے نبی کریم ﷺ کی آخرت میں شفاعت کا عقیدہ اپنے استاد کی ہاں میں ہاں ملا کر مان لیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''کوئی شخص گناہ کے بعد جلد ہی توبہ کر لینے کی سعادت تو حاصل نہیں کر سکا، لیکن اُس نے اتنی دیر بھی نہیں کہ موت کا وقت آن پہنچا ہو۔ اس صورت کے بارے میں قرآن خاموش ہے اور استاذ امام کے الفاظ میں، یہ خاموشی جس طرح امید پیدا کرتی ہے، اُسی طرح خوف بھی پیدا کرتی ہے اور قرآن حکیم کا منشا یہی معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ خوف و رجا کے درمیان ہی رہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے باوجود ذہن کبھی کبھی اِس طرف جاتا ہے کہ اس امت کے اس طرح کے لوگ، امید ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے، اس لیے کہ اُن کے بارے میں شفاعت کے ممنوع ہونے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔''

(میزان، ص 240، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

(4) قبر میں منکر نکیر کے ساتھ سوال و جواب کا عقیدہ:

اسی طرح انہوں نے حدیث کی بنیاد پر قبر کے عذاب اور قبر میں منکر نکیر کے آنے اور اُن کے اور میت کے درمیان سوال و جواب ہونے کے عقیدے کو دبے الفاظ میں مانا ہے۔

وہ پہلے قومِ فرعون کے بارے میں قرآن مجید کا حوالہ دے کر بیان کرتے ہیں کہ:

"عالم برزخ میں بھی صبح و شام انہیں دوزخ کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔"

(المؤمن:40:45،46)

پھر اس کے فوراً بعد لکھتے ہیں:

"روایتوں میں قبر کے جس عذاب و ثواب کا ذکر ہوا ہے، وہ یہی ہے۔ (بخاری رقم: 1379، مسلم رقم: 7211) نبی کریم ﷺ نے مزید بتایا ہے کہ آپ کی بعثت جن لوگوں میں ہوئی، اُن کے لیے اِس کی ابتدا اس سوال سے ہوگی کہ وہ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ (بخاری، رقم 374، مسلم رقم: 7216)۔ اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے۔ اپنی بعثت کے بعد رسول ہی اپنی قوم کے لیے حق و باطل میں امتیاز کا واحد ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے اُس پر ایمان کے بعد پھر کسی سے اور کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔" (میزان، ص 185، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

دیکھ لیجیے، غامدی صاحب کی مذکورہ بالا تحریر کتنی مبہم اُلجھی ہوئی اور مغالطہ انگیز ہے کہ انہوں نے واضح طور پر حدیث کا حوالہ دے کر یہ نہیں لکھا کہ قبر میں میت سے سوال کون کرے گا اور کل کتنے سوالات ہوں گے اور ان کی ترتیب کیا ہوگی؟

(5) یہ عقیدہ کہ گناہ گار مسلمانوں کو بھی دوزخ میں سزا بھگتنے کے بعد بالآخر جنت میں داخل کر دیا جائے گا:

اسی طرح غامدی صاحب نے یہ عقیدہ بھی محض حدیث کی بنیاد پر تسلیم کیا ہے کہ گناہ گار مسلمان بھی دوزخ کی سزا پانے کے بعد جنت میں جائیں گے۔

چنانچہ وہ کتنے یقین کے ساتھ حدیث سے ثابت اس عقیدے کو بغیر حوالۂ حدیث کے لکھتے ہیں:

"اس میں شبہ نہیں کہ دوزخ میں وہ لوگ بھی ہوں گے جو اپنے گناہوں کی سزا بھگت لینے کے بعد اُس سے نکال لیے جائیں گے۔"

(میزان، ص 191، طبع سوم مئی 2008ء، لاہور)

(6) حدیث اور سنت کی تعریف میں تضاد:

غامدی صاحب حدیث اور سنت کی دینی اصطلاحات کے بارے میں کس قدر اُلجھاؤ (Confusion) کا شکار ہیں اس کا اندازہ اس سے لگا لیجیے کہ کبھی وہ حدیث اور سنت کو بالکل الگ الگ قرار دیتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ سنت دین ہے اور حدیث دین نہیں ہے اور کبھی ان کو ایک ہی چیز قرار دیتے ہیں اور ہر بار ان دونوں کی صحت کے بارے میں یقین اور قطعیت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ وہ سنت کی یہ تعریف فرماتے ہیں:

"سنت سے ہماری مراد دین ابراہیمی کی وہ روایت ہے جسے نبی کریم ﷺ نے اُس کی تجدید و اصلاح کے بعد اور اُس میں بعض اضافوں کے ساتھ اپنے ماننے والوں میں دین کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔" (میزان ص 14، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

پھر دوسری جگہ اسی کتاب میں سنت کی یہ تعریف کر دیتے ہیں:

"سنت صرف اُنہی چیزوں کو کہا جائے گا جو اصلاً پیغمبر کے قول و فعل اور تقریر و تصویب پر مبنی ہیں۔" (میزان، ص 59)

ایک مقام پر وہ حدیث کی یہ تعریف لکھتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کے اخبار آحاد جنہیں بالعموم حدیث کہا جاتا ہے، ان کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ان سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ کبھی درجہ یقین کو نہیں پہنچتا، اس لیے دین میں ان سے کسی عقیدہ و عمل کا اضافہ بھی نہیں ہوتا۔" (میزان ص 15، طبع سوم، مئی 2008ء لاہور)

پھر دوسری جگہ اس کی مزید وضاحت فرماتے ہیں کہ:

''نبی کریم ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی روایتیں جو زیادہ تر اخبار آحاد کے طریقے پر نقل ہوئی ہیں اور جنہیں اصطلاح میں حدیث کہا جاتا ہے، اُن کے بارے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اُن سے دین میں کسی عقیدہ و عمل کا کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس مضمون کی تمہید میں ہم نے پوری صراحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ یہ چیز حدیث کے دائرے ہی میں نہیں آتی کہ وہ دین میں کسی نئے حکم کا ماخذ بن سکے۔'' (میزان ص 61، طبع سوم، مئی 2008ء، لاہور)

اس طرح غامدی صاحب کبھی حدیث کو سنت اور سنت کو حدیث قرار دیتے ہیں، کبھی سنت کو دین سمجھتے ہیں اور حدیث کو دین سے خارج کر دیتے ہیں کبھی سنت کی ابتدا ابراہیم علیہ السلام سے کرتے ہیں اور کبھی حضرت محمد ﷺ سے، اور کبھی حدیث ہی سے دین کے احکام بھی ثابت کرنے لگ جاتے ہیں۔

ہم یہاں پر اِس کتاب کے موضوع کی مناسبت سے صرف حدیث و سنت سے متعلق غامدی صاحب کے کھلے تضادات بیان کر رہے ہیں۔ دین کے دوسرے بنیادی امور اور قرآن مجید کے بارے میں اُن کے واضح تضادات اور قلابازیاں ہماری دوسری کتب میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اتنے ڈھیروں تضادات کا بیک وقت حامل ہونا صرف غامدی صاحب ہی کو زیب دیتا ہے۔ سچ ہے کہ

دروغ گو را حافظہ نباشد

8۔ کیا امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ معتبر راوی ہیں یا غیر معتبر؟

غامدی صاحب کے تضادات میں سے ایک تضاد یہ بھی ہے کہ وہ امام مالک رحمہ اللہ کے اُستاد مشہور محدث اور فقیہ، امام ابن شہاب زہری رحمہ اللہ کو غیر ثقہ اور نا قابل اعتبار راوی بھی قرار دیتے ہیں مگر پھر اُنہی کی روایت کردہ احادیث سے استدلال بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ غامدی صاحب نے صحاح کی مشہور حدیث ''سبعہ احرف'' پر بحث کرتے ہوئے اُس کے ایک راوی امام زہریؒ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"اُن (امام زہری رحمۃ اللہ علیہ) کی کوئی روایت بھی اس طرح کے اہم معاملات میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔" (میزان، ص 31، طبع سوم، مئی 2008ء)

اس مقام پر غامدی صاحب نے امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کو غیر ثقہ اور نا قابلِ اعتبار راوی قرار دیا ہے اور اُن کی کوئی روایت قبول کرنے سے انکار کیا ہے۔ حالاں کہ امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ کو محدثین، فقہاء اور ائمہ جرح و تعدیل نے ثقہ بلکہ اوثق اور قابلِ اعتبار راوی قرار دیا ہے۔

چنانچہ امام ابن حجر عسقلانی نے "تقریب" (جلد 2، ص 207) میں، امام ذہبی نے "میزان الاعتدال" (جلد 4، ص 40) میں اور امام ابن حبان نے "کتاب الثقات" (جلد 3، ص 4) میں اُن کو ثقہ اور قابلِ اعتبار راوی تسلیم کیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ غامدی صاحب امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کو غیر ثقہ اور غیر معتبر بھی قرار دیتے ہیں اور اُن کی مرویات بھی لیتے ہیں۔ اپنی جس کتاب "میزان" میں امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کو غیر ثقہ اور غیر معتبر قرار دیا ہے۔ اُسی کتاب کے تقریباً ہر باب میں اُن کی درجنوں روایت کردہ احادیث کو صحیح مان کر اُن سے اپنے حق میں استدلال بھی کیا ہے۔

مثال کے طور پر اپنی کتاب "میزان" (طبع سوم مئی 2008ء) کے درج ذیل مقامات پر خود غامدی صاحب نے امام زہریؒ ہی کی روایت کردہ احادیث سے استدلال کیا ہے:

1۔ ص 525 پر کافر اور مسلم کی وراثت سے متعلق صحیح بخاری کی حدیث نمبر 6764

2۔ ص 589 پر قانون جہاد سے متعلق اجر و ثواب کے بارے میں صحیح بخاری کی حدیث 2787

3۔ ص 622 پر حدود و تعزیرات میں قتل خطا سے متعلق صحیح بخاری کی حدیث نمبر 1499

4۔ ص 651 پر قسم اور کفارہ سے متعلق ابوداؤد کی حدیث نمبر 3290

اس طرح غامدی صاحب کے ہاں یہ کھلا تضاد پایا جاتا ہے کہ وہ امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کو ایک جگہ غیر ثقہ اور غیر معتبر قرار دیتے ہیں اور دوسری جگہوں پر اُن کو ثقہ اور معتبر قرار دے کر اُن کی روایت کردہ احادیث سے استدلال بھی کرتے ہیں تو کیا یہ اُصول پرستی ہے یا خواہش پرستی؟



ضمیمہ:

جاوید غامدی صاحب سے سو(100) سوالات

جاوید احمد غامدی صاحب کی اصل شخصیت کو جاننے اور اُن کے مخصوص گمراہ کن عقائد و نظریات کو سمجھنے کے لیے ذیل میں ایک معلوماتی سوال نامہ جاری کیا جاتا ہے:

1: شخصیت کے بارے میں

1۔ سنا ہے آپ ککے زئی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ عرب قبیلے غامد کی نسبت سے غامدی کیوں کہلاتے ہیں؟ کیا اسلام میں اس طرح اپنا نسب بدل لینا جائز ہے؟

2۔ کیا آپ کی تعلیم صرف بی۔اے ہے؟

3۔ کیا آپ کسی دینی مدرسے سے فارغ التحصیل اور سند یافتہ ہیں؟

4۔ سنا ہے آپ جماعت اسلامی کے رکن (ممبر) بھی رہے ہیں؟

5۔ اگر ایسا ہے تو پھر آپ نے جماعت کو کیوں چھوڑا؟ یا آپ کو جماعت سے نکال دیا گیا؟

6۔ جماعت سے نکالے جانے کا سبب کیا تھا؟

7۔ کیا مولانا مودودی آپ کی مالی امداد بھی کرتے رہے؟

8۔ کیا کسی امریکی سفیر نے آپ سے کبھی ملاقات کی؟ اگر کوئی ملاقات ہوئی تو یہ کب اور کہاں ہوئی تھی؟

9۔ کیا سابق صدر پرویز مشرف سے بھی آپ کی ملاقات رہی؟

10۔ کیا اُن کے لیے آپ نے ایک تقریر بھی لکھی جو انہوں نے امریکہ میں جا کر جیوش

کانگریس کے سامنے پڑھی تھی؟

2۔ قرآن مجید سے متعلق

11۔ آپ نے اپنی کتاب 'البیان' میں لکھا ہے کہ قرآن مجید کے سات (7) ابواب ہیں، اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟

12۔ کیا صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور پہلے دور کے مفسرین میں سے کسی نے قرآن مجید کے سات ابواب ہونے کا ذکر کیا ہے؟

13۔ کیا قرآن کی صرف ایک ہی قراءت (Pronounciation) درست ہے اور باقی کوئی قراءت درست نہیں؟

14۔ اگر ایسا ہے تو جو لوگ دوسری قراءتوں (سبعہ، عشرہ) کو بھی درست مانتے ہیں اُن کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

15۔ کیا قرآن کے متن (Text) اور رسم الخط (Script) میں اس بات کی کوئی گنجائش ہی نہیں کہ وہ ایک کے سوا کسی دوسری قراءت کو قبول ہی نہیں کرتا؟

16۔ کیا قرآن کا ایک صفاتی نام ''المیزان'' بھی ہے؟ امت کے کسی معتبر اور مستند مفسر قرآن یا عالم دین کا نام بتایئے جس نے قرآن کا ایک صفاتی نام ''المیزان'' بتایا ہو؟

17۔ کیا سورہ النصر مکی سورہ ہے؟

18۔ کیا کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا؟

19۔ کیا قرآن مجید کے الفاظ کے صرف معروف معنی لینا درست ہے؟

20۔ پھر آپ نے اپنی کتاب ''البیان'' میں بعض قرآنی الفاظ کے ''غیر معروف'' معنی کیوں لیے ہیں جیسے سورۂ اللھب میں تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ۔ اس کے معروف معنی ''ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے'' کے ہیں مگر آپ نے اس کے معنی ''ابولہب کے بازو ٹوٹ گئے'' کیوں مراد لیے ہیں۔ اسی طرح سورۂ المدثر آیت 4 میں ''وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ''

کے معروف معنی ہیں ''اور اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھ۔'' مگر آپ نے اس کے غیر معروف معنی لیے ہیں کہ ''اور اپنے دامن دل کو پاک رکھو''۔ کیا ثِیَابٌ کے معروف معنی ''کپڑوں'' کے نہیں ہے اور عربی زبان میں ثِیَابٌ کے معنی ''دامن دل'' کے ہرگز نہیں ہوتے۔

21۔ کیا سورۂ الفیل میں اصحابِ فیل کا جو واقعہ مذکور ہے اس کے مطابق ابرہہ کے ہاتھیوں کا لشکر پرندوں کے کنکر برسانے سے تباہ ہوا تھا یا اس کی تباہی کا کوئی اور سبب تھا؟

22۔ کیا سورۂ کوثر میں کوثر سے خانہ کعبہ مراد لیا جاسکتا ہے؟

23۔ قرآن مجید میں ''اصحاب الاخدود'' (کھائیوں والے) کا ذکر آیا ہے۔ کیا اس سے قریش کے سردار مراد ہیں؟

24۔ سورۂ عبس کا شانِ نزول کون سا واقعہ ہے؟

25۔ قرآن مجید کی سورہ الحجر آیت ۸۷ میں ''سبع مثانی'' کا ذکر آیا ہے کیا اس سے سورۂ فاتحہ مراد نہیں ہے؟

26۔ سورۂ الاعلیٰ آیت 5 میں فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی کے الفاظ آئے ہیں ان کا کیا ترجمہ ہے؟

27۔ قرآن مجید کی سورۂ بنی اسرائیل کی آیت 79 میں مقامِ محمود کا ذکر آیا ہے آپ کی رائے میں اس کا کیا مطلب ہے؟

28۔ کیا معراج کا واقعہ بیداری کی حالت میں ہوا تھا یا پھر نبی ﷺ کو وہ سب کچھ خواب میں دکھایا گیا تھا؟

29۔ قرآن مجید کی سورۂ البقرہ آیت 143 میں اُمَّةً وَّسَطًا کے الفاظ آئے ہیں۔ کیا ان سے صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت مراد ہے اور بعد کی امت اس میں شامل نہیں۔

30۔ کیا قرآن مجید کے بعض مقامات پر سجدۂ تلاوت واجب ہے؟

31۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے غزوات کے ذریعے کفار کے خلاف جہاد کیا تھا؟ یا یہ جہاد نہیں تھا اور یہ کافروں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا تھا۔

32۔ کیا اب مسلمانوں کے لیے کفار کے خلاف جہاد کرنے کا حکم باقی نہیں رہا؟

33۔ کیا اسلام میں صرف دفاعی جہاد جائز ہے اور جارحانہ جہاد جائز نہیں ہے۔

34۔ کیا غیر مسلم ذمیوں سے جزیہ لینے کا حکم منسوخ ہو گیا ہے؟

3۔ حدیث وسنت سے متعلق

35۔ کیا سنت قرآن سے مقدم ہے؟

36۔ آپ کے نزدیک سنت سے کیا مراد ہے؟

37۔ سنت کا آغاز حضرت محمد ﷺ سے ہوتا ہے یا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے۔

38۔ کیا قرآن مجید کے ثبوت کی طرح سنت کے ثبوت کے لیے بھی تواتر اور اجماع کی شرط ہے؟

39۔ کیا سنت کا تعلق صرف اعمال سے ہے اور اس میں اقوال شامل نہیں ہیں؟

40۔ آپ نے اپنے ماہنامے ''اشراق'' مئی 1998ء میں پہلے چالیس (40) اعمال کو سنت لکھا اور پھر مئی 2008ء میں آپ نے اپنی کتاب ''میزان'' میں صرف ستائیس (27) اعمال کو سنت قرار دیا۔ کیا وقت کے ساتھ ساتھ سنن میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر دس برسوں کے اندر تیرہ (13) سنتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے تو کیا باقی 27 سنتوں کا اگلے بیس (20) سال میں خاتمہ نہیں ہو جائے گا اور ہم ہر قسم کی سنتوں سے چھٹکارا نہیں پالیں گے؟

41۔ آپ کے نزدیک حدیث کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

42۔ کیا حدیث سے دین اسلام کا کوئی حکم، عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا۔

43۔ کیا ختم نبوت کا عقیدہ صرف حدیث سے ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ کیا اذان کا طریقہ اور اُس کے الفاظ حدیث ہی سے ثابت نہیں ہیں اور مرتد کی سزائے قتل حدیث سے ثابت نہیں ہے؟

44۔ کیا حدیث کے ذریعے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص یا تحدید نہیں ہو سکتی؟

45۔ کیا حدیث کی حفاظت اور تبلیغ واشاعت کا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا؟

46۔ یہ قرآن کا حکم ہے یا یہ حدیث سے ثابت حکم ہے کہ کوئی مرد اپنے نکاح میں بیک وقت پھوپھی اور بھتیجی کو یا خالہ اور بھانجی کو نہ رکھے؟

47۔ کیا امام ابن شہاب زہری رحمۃ اللہ علیہ نا قابل اعتبار راوی حدیث تھے؟

48۔ کیا آخرت میں پل صراط ہوگا۔

49۔ آپ نے اپنی کتاب ''میزان'' میں لکھا ہے کہ جانور کی قربانی کرنا نفل ہے، سنت ہے، قانون ہے؟ کیا کوئی نفلی کام بھی قانون ہوتا ہے؟

4۔ فقہی مسائل سے متعلق

50۔ کیا شریعت میں کھانے کی صرف یہی چار چیزیں حرام ہیں: خون، مردار، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ؟ اور کیا کھانے کے سوا خزیر کی چربی اور بالوں کا کوئی دوسرا استعمال جائز ہے۔

51۔ اسلامی شریعت کے مصادر و ماخذ کون کون سے ہیں؟

52۔ معروف اور منکر کا تعین اسلامی شریعت کرتی ہے یا انسانی فطرت؟

53۔ کیا اجماع کے خلاف بھی اجتہاد کیا جا سکتا ہے؟

54۔ کیا نماز میں عورت مردوں کی امامت کر سکتی ہے؟

55۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از بعثت بھی عید الفطر اور عید الاضحیٰ منائی تھیں اور ان کی نمازیں بھی پڑھی تھیں؟

56۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے کبھی کوئی روزہ رکھا؟

57۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت سے پہلے بھی حج کیا تھا؟

58۔ کیا اسلامی قمری مہینے کے آغاز کی تعیین کے لیے رویت ہلال (چاند دیکھنا) ضروری شرط

نہیں ہے؟

59۔ کیا زکوۃ کا نصاب اور مقداریں (مقادیر) مقرر اور منصوص نہیں ہیں۔ یا ان میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے؟

60۔ کیا مسلم حکومت کسی شخص کو زکوۃ سے مستثنیٰ کر سکتی ہے؟

61۔ کیا بنو ہاشم (سادات) کو زکوۃ دینی جائز ہے؟

62۔ کیا کوئی کافر کسی مسلمان کا اور کیا کوئی مسلمان کسی کافر کا وارث ہو سکتا ہے؟

63۔ کیا قاتل مقتول کا وارث ہو سکتا ہے؟

64۔ اگر صرف بیٹیاں وارث ہوں تو ان کو کل میراث کا دو تہائی $\frac{2}{3}$ حصہ نہیں ملے گا؟

65۔ کیا تجارتی بنکوں کا منافع ربا یعنی سود ہے؟

66۔ کیا مکان بنانے کے لیے بنک سے سود پر قرضہ لیا جا سکتا ہے؟

67۔ کیا زندگی کا بیمہ (Life Insurance) جائز ہے؟

68۔ مردوں کی داڑھی کے بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے؟

69۔ کیا مسلمان عورت کے لیے پردے کا شرعی حکم نہیں ہے؟

70۔ کیا عورت نکاح خواں بن سکتی ہے؟

71۔ کیا جاندار کی تصویر جائز ہے؟

72۔ کیا شریعت میں موسیقی اور گانا بجانا حرام نہیں ہے؟

73۔ کیا اسلام میں مجسمہ سازی اور مجسّمے (Sculptures) جائز ہیں؟

74۔ کیا اسلامی شریعت میں صرف دو جرائم ...... قتل اور فساد فی الارض کے سوا کسی اور جرم میں قتل کی سزا نہیں دی جا سکتی؟

75۔ کیا اسلام میں مرتد کی سزا قتل نہیں ہے؟

76۔ کیا اسلامی شریعت میں شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگساری کے ذریعے قتل کی حد نہیں ہے؟

77۔ جرمِ زنا کے ثبوت کے لیے گواہوں کا نصاب کیا ہے؟ اور کیا حدود کے مقدمات میں عورت کی گواہی بھی معتبر ہے؟

78۔ کیا نبی کریم ﷺ نے کسی شادی شدہ زانی کو صرف سو کوڑوں کی سزا دی تھی؟

79۔ کیا نبی کریم ﷺ نے کسی کنوارے زانی کو زنا بالجبر یا اوباشی کے جرم میں رجم یا سنگساری کی سزا دی؟

80۔ کیا شراب نوشی پر شرعی سزا نہیں ہے؟

81۔ کیا ہم جنس پرستی (Homosexuality) گناہ اور حرام ہے؟

82۔ کیا اسلامی شریعت میں قسامہ کا فوجداری قانون موجود ہے؟

83۔ کیا نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا؟

84۔ کیا قادیانی غیر مسلم نہیں ہیں؟

85۔ کیا ہندو مشرک نہیں ہیں؟

5۔ متفرق سوالات

86۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں اور وہ قیامت کے قریب دنیا میں دوبارہ تشریف نہیں لائیں گے؟

87۔ کیا قربِ قیامت میں امام مہدی نہیں آئے گا؟

88۔ کیا دجال کسی خاص شخصیت کا نام نہیں ہے؟

89۔ یاجوج ماجوج سے کیا مراد ہے؟

90۔ کیا قربِ قیامت میں سورج کے مغرب سے نکلنے کا یہ مطلب ہے کہ اُس وقت مغربی اقوام کا سیاسی غلبہ ہوگا۔

91۔ آپ کی رائے میں سکول کے بچوں کو کس عمر میں اور کس کلاس سے اسلامیات کی تعلیم شروع کرائی جائے؟

92۔ تصوف کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

93۔ کیا عراق اور افغانستان پر امریکی حملوں کا کوئی جواز تھا؟

94۔ کیا افغانستان، عراق اور فلسطین میں مسلمانوں کی طرف سے خودکش حملے جائز ہیں؟

95۔ لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے واقعے میں کون قصوروار تھا؟

96۔ آپ کی رائے میں اسامہ بن لادن اور ملا عمر دہشت گرد ہیں یا مجاہد؟

97۔ کیا مقبوضہ کشمیر میں جہاد ہو رہا ہے؟

98۔ کیا اقامت دین بھی کوئی دینی فریضہ ہے؟

99۔ کیا نظام خلافت کا قیام مسلمانوں کی شرعی ذمہ داری نہیں ہے؟

100۔ مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کا حق ہے یا یہودیوں کا؟



ضمیمہ

غامدیات

(غامدی صاحب کا منظوم تعارف)

1۔غامدی نامہ

'تقریر تیری ، ساحری تحریر تیری ، منطقی
کیا خوب تیری شاعری ویسے تو ہے گلّے زئی

جاوید احمد غامدی

کونسل کا تو ممبر بھی ہے ٹی وی کا دانش ور بھی ہے
مغرب کا نامہ بر بھی ہے اے منکرِ وحیِ خفی!

جاوید احمد غامدی

کتنے ہی تیرے ہم سفر کرتے گئے تجھ سے حذر
جس کا سبب یہ تھا مگر ہے بے مروّت آدمی

جاوید احمد غامدی

جب جھوٹ مسجد میں کہا تھا سامنے قرآں دھرا
یوں تو 'جماعت' سے گیا پائی نئی پھر روشنی

جاوید احمد غامدی

معنیٔ سنت بھی غلط؟ اجماعِ اُمت بھی غلط؟
سبعہ قراءت بھی غلط؟ مرتد کی حد ساقط ہوئی

جاوید احمد غامدی

تصویر زندہ کی درست؟ رقص اور موسیقی درست؟
خـــمَ کے معنی درست؟ کیا مرچکے عیسیٰ نبیؑ!

جاوید احمد غامدی

اے ناقدِ حکمِ جہاد تاویلِ باطل کا فساد
اے اہلِ مغرب کی مراد پرویز و مرزا کی کڑی

جاوید احمد غامدی

اے منکرِ شرعِ متین! اے حامیٔ اعدائے دین!
'روشن خیالی ایں چنین' تو از کجا برآمدی؟

جاوید احمد غامدی

أَنْكَرْتَ حَدَّ الْمُرْتَدِ بَدَّلْتَ دِيْنَ أَحْمَدِ
لَا تَصْلُحُ، لَا تَهْتَدِيْ أَنْتَ كَضَالٍّ مُلْحِدِ

اَلْغَامِدِيُّ الْغَامِدِيْ



2۔ غزل

رباب غامدی میں ہے وہی آہنگِ پرویزی
وہی ذوقِ تجدّد، ترکِ سنت ، فتنہ انگیزی

بھروسا کر نہیں سکتے کبھی دانش فروشوں پر
سکھاتے ہیں مسلماں کو جو اُمت سے کم آمیزی

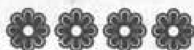
ہمیشہ بولتے ہیں دشمنانِ دین کی بولی
جہادِ غوری و محمود کو کہتے ہیں خوں ریزی

چمن میں نظم لاتے ہیں وہ مصنوعی طریقے سے
گھٹا دیتے ہیں جس سے حسنِ فطرت کی دل آویزی

پرے ہے سرحدِ اِدراک سے جبریلؑ کی دنیا
جہاں بے کار ہو جاتی ہے اَسپِ عقل کی تیزی

یہ دینِ حق خود اِک طوفانِ عالمگیر ہے جس کو
ڈرا سکتی نہیں باطل کی موجوں کی بلاخیزی

رفیقؔ اُن سے توقع خیر کی ہم کو نہیں ہرگز
سیاست جن کی لادینی، قیادت جن کی چنگیزی



3۔ تضمین بر شعرِ اقبال

یہ خلل دماغ کا ہے یا کسی کی مہرہ بازی
کہ مصوری ہے جائز، ہے حلال نَے نوازی

وہ تو بات غیر کی تھی جو تیری زباں سے نکلی
کہ اُسامہ اور اَیمن، نہ مجاہد ہیں نہ غازی

یہ کڑا ہے وقت مانا، مگر اِس قدر نہیں ہے
کہ جو غزنوی ہے اُس کو بھی سکھائے تو ایازی

یہ ''شراقیوں'' سے کہہ دو کہ رہے گی تا قیامت
وہ محمدی شریعت کہ نہیں فقط حجازی

یہ ترا عجیب دعویٰ کہ جو دین تو نے سمجھا
نہ سمجھ سکا تھا اس کو کوئی شافعی، نہ رازی

یہ ترا اُصولِ باطل کہ 'حدیث دیں نہیں ہے'
ہے خسارا ہی خسارا، یہ نبیؐ سے بے نیازی

نہ کوئی اُصول تیرا، نہ کوئی رفیق مذہب
ہے کبھی سخن طرازی، ہے کبھی زباں درازی

''تو بدل گیا تو بہتر کہ بدل گئی شریعت
کہ موافقِ تَـــــذَرْواں نہیں دینِ شاہبازی''

4۔ صاحبِ اشراق کے اُسرار و رموز

صاحبِ اشراق کے کھلتے ہیں اَسرار و رُموز
کشورِ پنجاب میں وہ روحِ مرزا کا بُروز
رقص و موسیقی ہوئے اُس کی شریعت میں حلال
ہے حرام اِس دور میں کفّار سے جنگ و قتال

ہو چکی اُس کی نظر میں ابنِ مریمؑ کی وفات
اور افسانہ کہ اُن سے کھائے گا دجّال مات
اُس کی ہر گفتار میں مذہب کی تاویلات دیکھ
رشتۂ الفاظ میں اُلجھی ہوئی ہر بات دیکھ

بندۂ حُر کو سکھاتا ہے غلامی کے طریق
اہلِ حق سے ہے جدا، وہ اہلِ باطل کا رفیق
قرب حاصل ہے اُسے سرکار کے دربار میں
ہے مگر خود جنسِ ارزاں وقت کے بازار میں

آج وہ ہے لشکرِ اَعدا کے دل کی آرزو
رنگ لائے گا مگر اپنے شہیدوں کا لہو

اُس کے مے خانے میں ہے کیسی کرامت کا ظہور

جامِ مشرق لاتا ہے مغرب کی صہبا کا سُرور

نغمۂ بے سوز پوشیدہ ہے اس کے ساز میں

غیر کا مطلب ہے پنہاں اُس کی ہر آواز میں

اس کے نظمِ باطنی سے پیدا بد نظمی ہوئی

اور قرآں کو سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی

'غامدیت' دین کی راہوں میں کج بینی کا نام

'غامدیت' دین کے پردے میں بے دینی کا نام

جس میں ہے بُوئے تجدّد، دین کا انکار بھی

پائے جاتے ہیں رفیقِ اِلحاد کے آثار بھی



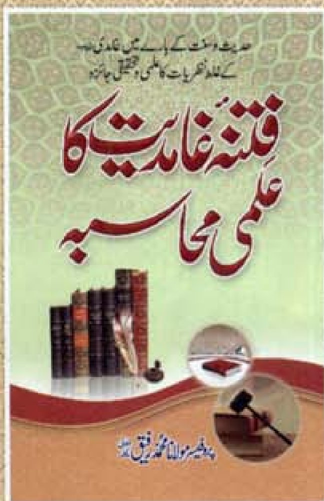
غامدی مذہب کیا ہے؟

پروفیسر مولانا محمد رفیق

- قرآن کی صرف ایک قراءت درست ہے باقی سب قراءتیں عجم کا فتنہ ہیں۔
- سنت قرآن سے مقدم ہے۔
- سنت صرف ستائیس (27) اعمال کا نام ہے۔
- حدیث سے کوئی عقیدہ یا عمل ثابت نہیں ہوتا۔
- معروف اور منکر کا تعین وحی نہیں بلکہ انسانی فطرت کرتی ہے۔
- نبی ﷺ کی وفات کے بعد کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔
- موسیقی اور گانا بجانا بالکل جائز ہے۔
- مرتد کی سزا قتل نہیں ہے۔
- شادی شدہ زانی کے لیے صرف سو کوڑوں کی سزا ہے۔
- شراب نوشی پر کوئی شرعی سزا نہیں ہے۔
- غیر مسلم بھی مسلمان کا وارث ہو سکتا ہے۔
- کھانے کی صرف چار چیزیں حرام ہیں: خون، مردار، سؤر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام کا ذبیحہ۔
- عورت کے لیے دوپٹہ یا اوڑھنی پہننا کوئی شرعی حکم نہیں۔
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔
- کفار کے خلاف جہاد و قتال کا شرعی حکم باقی نہیں ہے۔

ان سب کے حوالہ جات اور مزید تفصیلات کے لیے کتاب ہذا کا مطالعہ کیجئے

ناشر...... مکتبہ قرآنیات، لاہور





مکتبہ قرآنیات ○ لاہور
یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
0321-7724032 , 0333-4399812